شمع انجمن

از
صادق الخیری - ایم - اے - دہلوی

کتب خانہ علم وادب - دہلی

طبع اول

ستمبر ۱۹۴۲ء
دِلی پرنٹنگ ورکس دہلی

قیمت عمر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گلزار

شمعِ انجمن

تقدیر کا دیوتا

اے کاتبِ قسمت! یہ نوشتہ میرا!
دستور نہیں کیا نظرِ ثانی کا؟

زاہدِ شب گذار کی طرح، بوڑھے آسمان نے ایک ضرب لگائی۔ فضا میں نعرۂ حق گونجا، اور جیسے کسی پاک باطن کا قلب انوارِ رحمت سے جگمگا اٹھے، فلک کبر رو کے سینے سے نکلی ہوئی تنویرِ الٰہی سے آن کی آن میں سارا اشنار منور ہو گیا۔ بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک، گویا دیدارِ محبوب کی جھلک اور دلِ مجروح کی آہ و بکا تھی۔ ایلوا افسانہ نگار کا تخیل ایکا ایکی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور اس کی نظریں، آخرِ شب سیب کے سہمے ہوئے شگوفوں کی مانند سفت

رفعت پسند کی طرف اُٹھ گئیں۔ اسکے تصور نے دیکھا کہ دور۔ بہت دور کالے کالے بادلوں کی چٹانوں پر ایک عظیم اور پرشکوہ تخت رکھا ہوا ہے اور اسکی مسند سے ٹیک لگائے ایک عجیب الخلقت ہستی اسپر متمکن ہے۔ اس کا ڈیل ڈول، اُس کے کس بل، اس کا قدو قامت، المختصر اسکی ساری ہیئت ہم انسانوں سے بالکل جُدا ہے اور اپنے آثار و رعب داب کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کا آقا، حاکم، بلکہ قادرِ مطلق معلوم ہوتا ہے۔ اسکے تن و توش کو قطعی قرار نہیں، کسی کل چین نہیں۔ اُس کا ہر عضو بِھر کے جاتا ہے، قہقہے اُسکے روئیں روئیں سے پھوٹے پڑتے ہیں۔ اُس کے کانوں تک پھیلے ہوئے دہانے پر دوسروں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھکر پیدا ہونے والی خوشی اور ایذا رساں ہنسی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی ہے، ایسی شرارت جو اپنے سے کمزور کا مذاق اُڑانے کے لئے ہر وقت مچلتی ہے۔ اس کا بے ہنگم پیٹ اس کی موٹی موٹی رانوں سے آگے نکلا ہوا ہے۔ اسکی پتھریلی کلائیاں گھٹنوں پر ٹکی ہوئی ہیں اور ہاتھوں میں دو کٹھ پُتلیاں ہیں۔ شاید ان دونوں کے نچانے سے اب اُس کا جی نہیں بہلتا۔ اِسی لئے اُس نے اُن کو ایک طرف پھینکا اور جُھک کر تخت کے نیچے نظر دوڑائی۔ پایوں کے ارد گرد بے شمار گڑیاں اور گڈے بے جان لاشوں اور بے کار مورتیوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے اُن کو لاپروائی سے دیکھا اور معًا، جیسے کوئی تاریک حمام میں سے کھوئی ہوئی انگوٹھی ڈھونڈھ نکالے اُس نے گڑیوں کے انبار میں سے ایک کامنی مورت نکالی، بیچ میں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اور ہنستے ہنستے اس کی تیوری پر ذرا سا بل نمودار ہوا اور ——— اور ——— یہ کیا؟ گڑیا کی پیشانی پر خط کھنچتے چلے گئے۔ اور وہ ——— تقدیر کا دیوتا! ——— ان خطوں پر اپنی موٹی موٹی بھدی انگلیاں پھیرتے ہوئے دم بدم تیز ہونے والے قہقہے لگانے لگا۔ اور اس کی آنکھوں میں چھیڑ اور شرارت شعلۂ جوالا کی طرح ناچنے لگیں

نغمہ و رقص

فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں شعلے
کوئی عاشق بنایا جا رہا ہے

اژدہام اتنا کہ پناہ بخدا، سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، لیکن تماشبین اس کثرت سے، اس لئے نہیں آئے تھے کہ ان کے ٹکٹوں کے دام خیرات میں دیئے جائیں گے۔ بلکہ وہ اس وقت مہادیو صرف اس لئے بنے تھے کہ آج رات بے شمار خوبصورت لڑکیوں کے علاوہ کنول بھی، جس کے حسن و کمال سے ہر شخص اپنے ذوقِ بصارت کی تسکین کرنا چاہتا تھا، فن رقاصی کے جوہر دکھانیوالی تھی۔

یکے بعد دیگرے کئی ایک لڑکیاں ——— کالجوں کی طالبات، چہیتے والدین کی لاڈلیاں، موسیقی کی دلدادہ اور نمائش حسن کی شوقین ——— اپنے اپنے رقص و سرود کا منچلے مردوں سے خراج تحسین لیکر چلی گئیں تو تماشے کا سب سے اہم منظر پیش ہوا۔ اسٹیج پر جا بجا چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی قمقمے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ دائیں بائیں، بیل بوٹوں اور ہری ہری ٹہنیوں سے سجی ہوئی دیواریں کھڑی تھیں پُشت کے زرد پردے پر ہنود و صنمیات کے نقش و نگار تھے۔ اُلٹے ہاتھ کو ترچھی سمت چھوٹے پیمانے پر ایک خوبصورت پیتل کا چمکدار مندر بنا ہوا تھا۔ جس میں پتھر کے سیاہ کرشن مراری ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ آڑھی رکھے ہوئے، کھڑے کھڑے بانسری کی لے پر گوپیوں اور گایوں کو پکار رہے تھے۔ غرض ساری فضا میں کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی تھی گویا گوکل میں شام ہو رہی ہے۔ ہال میں سکوت طاری تھا، بس اسٹیج اور طرفین کے پیچھے سے بانسری کی ہلکی ہلکی آواز اور گھنگروؤں کی مدھم سی باج سُنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر اسٹیج یوں ہی خالی رہا۔ اور پائل کی جھانجھ اور مُرلی کی لے لمبے لمبے، پر ہوتے ہوئے

سُروں میں گونجتی رہی۔ لوگوں کا اشتیاق دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔ لیکن ان کی نظریں بجز سیاہی مائل نیلے بُت کی سفید بڑی بڑی آنکھوں کے، وہاں کچھ نہ پاتی تھیں۔ پھر یکایک گویا کٹورا سا جو الا ابھی کھل گیا ہو، دائیں طرف کی دیواروں میں وہ ——— کرشن کی دیودا سی ——— چھم چھم کرتی نمودار ہوئی۔ اس کے قدم ایک خاص انداز میں، کبھی پہلے ایڑی، کبھی پہلے پنجہ، بہت آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ اور اس پُراحتیاط جُنبش سے پازیب کی وہ دلنواز موسیقی پیدا ہو رہی تھی جو صرف کلاسیکل رقص میں دیوداسیوں کے جھٹکوں کیلئے مخصوص ہے۔ اُس کا لباس قدیم وضع کا تھا۔ ساڑی کی بندش چُست اور دلفریب، مگر ایسی مضبوط تھی کہ جب وہ پربھو کو خوش کرنے کے لیے، بیخود ہو کر بے پناہ رقص کرے تو اس وقت بھی ساڑھی ڈھیلی یا کہیں سے کھل نہ جائے۔ سر پر وہ ایک مختصر سا تاج پہنے ہوئے تھی، جیسا آپنے اکثر تصویر میں سری کرشن کے سر پر دیکھا ہوگا۔ اُس کے بال بنگالنوں کی مانند گھنے، کشمیرنوں کی طرح ریشمیں اور شمالی ہند کی دوشیزاؤں جیسے لانبے تھے لیکن اس وقت اُن کی چوٹی نہیں گندھی ہوئی تھی۔ بلکہ جوڑا بندھا ہوا تھا جس میں موگرے کے پھول سلیقے سے آراستہ کیے گئے تھے۔ اس کی رنگت گیروا تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی کسی ایسے چشمے سے نہا کر آئی ہے۔ جس میں صبح کا نور اور شفق کی لالی مل کر بہتی ہے۔ اس کی فراخ پیشانی پر سُرخ گلاب کی چھوٹی سی گول کتری ہوئی پنکھڑی، بندی کے بجائے، چسپاں تھی۔ نرگسی آنکھوں میں دُنبالے دار کاجل تھا۔ ناک میں ہیرے کی ننّھی سی کیل جگمگا رہی تھی۔ شہابی رخساروں پر جوانی کا غازہ تھا۔ اور کبھی اسکے لب ہائے لعلیں وا ہوتے تھے تو اُس کے خوبصورت دانت یوں نظر آتے جیسے دستِ حنائی پر سچے موتیوں کی لڑی ہو۔ صراحی دار گردن میں چھوٹے چھوٹے انمول جواہر کا ایک سندر ہار تھا۔ گویا ننھے ننھے چمکدار ستارے چاند کا طواف کر رہے ہیں۔ اُس کی ساڑی سیاہ رنگ کی تھی۔ جس کے کناروں پر سنہری تُرنج اور باقی سارے حصّے میں لال سبز ستارے ٹکے ہوئے

تھے، اور جب وہ ناچتے ناچتے مختلف رنگوں کی روشنیوں میں سے گذرتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نئی سہاگن نے پوتر گنگا کے کنارے چراغاں کر رکھا ہے۔ المختصر، اسکے سارے جسم سے شعریت، موسیقی اور حسن کی کرنیں پھوٹی پڑتی تھیں اور وہ مجسم نغمہ و رقص بنی ہوئی شعلوں کی لپک کی طرح دست و پا اور پشت و سینہ کے ترقّص میں مصروف تھی ..... مگر نہیں، یہ سراپا نامکمل بیان ہوا۔ افسانہ نگار اِس دیو داسی کے روپ سروپ کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ جو اس وقت گیندے کے زرد پھولوں کو روندتی ہوئی، دنیا و مافیہا سے غافل، مُرلی والے کے سامنے ناچ جا رہی تھی اور اس کنول کی مانند معلوم ہوتی تھی جو بلّوریں تالاب کے بیچوں بیچ، نسیم صبحگاہی کے دوش پر اٹھلا رہا ہو۔

اُس نے بھگوان کے چرنوں میں سے تھالی اُٹھائی جس میں سات دیئے روشن تھے۔ اور مائل بہ سکون ہوتے ہوئے رسان رسان آرتی کرنے لگی۔ دُور سے ایک پروانہ دوڑا ہوا آیا اور چاہتا تھا کہ شعلے سے ہم آغوش ہو جائے کہ عین اسی لمحے دیئے کی لَو لہرا کر پیچھے ہو گئی اور پروانہ غریب وہیں پرے کے پرے چکّر کاٹنے لگا ———— کنول لغزیدہ قدموں سے پیچھے ہٹی اور اُس نے ایکا ایکی دزدیدہ نگاہوں سے تماشبینوں کو دیکھا ..... ارے یہ کون؟ سامنے مکیش چندر بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کی مشتاق نگاہیں اُسے اُن کے دل کا پیغام پہونچا رہی تھیں۔ آخر اُس نے اِس پیام کو پڑھ لیا اور وہ چھم چھم کرتی سُبک روی سے آناً فاناً پس پردہ چلی گئی۔

ناچ ختم ہو گیا مگر جو دھڑکن اِس سمے کنول اور مکیش کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی وہ چنگاری کی طرح سلگنے لگی اور جب دمِ رخصت غلام گردش کی اوٹ میں شہ نشین کے سہرے پر، یاسمین کی بیلوں کے سائے میں مکیش نے سرگوشی میں کہا "کنول! تم اِسوقت بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو!" تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ نچلے ہونٹ کو

دانتوں میں دبائے اور آنسوؤں کی دو بوندوں کو پپوٹوں میں چھپائے وہ وہاں سے چلی گئی۔

اب آپ ان دونوں کی کہانی کیا سنیئے گا۔ حُسن و محبت کی یہ داستان آپ نے بار بار سنی ہے! مختصراً یوں سمجھیے کہ جب کنول اور مکیش جیون ساگر میں پریم کی نیا کھیتے کھیتے بہت دور نکل گئے ہیں تو انہیں محبت کے عام دستور کے مطابق محسوس ہوا کہ انہوں نے غلط راہ اختیار کر لی ہے۔ وہ دونوں تو کبھی ایک دوسرے کے ہو ہی نہیں سکتے۔ کنول کی سگائی جو ہو چکی ہے! اور جب کنول کا گونا ہوا تو دونوں کی آرزوں پر اوس پڑ گئی۔ مکیش نے گویا ایک سپنا دیکھا تھا جس کے ختم ہونے پر وہ دل مسوس کر رہ گیا ہے۔ اُس نے چاہا کہ الفت کے اس نقش اولیں کو مٹا دے، لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ آخر اُس نے کچھ عرصے کے لئے وہ شہر چھوڑ دیا۔ جہاں ان دونوں کی محبت پروان چڑھی تھی اور بیرسٹری کرنے کے خیال سے ولایت چلا گیا۔ مگر کنول کیا کرے؟ وہ عورت ذات، بیاہ کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی سوائے اسکے اور کیا کر سکتی تھی کہ اپنا جی بہلائے اور دل پر میل نہ آنے دے۔

مہندر سے شادی ہوئے تین سال بیت گئے۔ مگر اس عرصے میں مکیش کی یاد کنول کے دل سے قطعی محو...... نہیں ہوئی۔ جیسے برسات کی بھیگی ہوئی تیرہ و تاریک رات میں کہیں میلوں پرے، کسی جوگی کی کٹیا میں دیا جل رہا ہو، اُس کے دل میں مکیش کا موہوم سا خیال ہر وقت موجود رہتا۔ اور یہ اتنا ضبط، یہ اسقدر اخفائے محبت بھی اسلئے ہو سکا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی، بڑے گھرانے کی بیٹی اور کالج کی آزادی پسند طالبعلم تھی۔ سیر و تفریح کی دلچسپیوں اور بے فکر لمحات کی خوش فعلیوں نے اُس کے دل پر سے وہ غبار دھو دیا جو مکیش کے یکلخت نظروں سے اوجھل ہو جانے پر پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ہر وقت

کی آزادی اُس کی ازدواجی زندگی کے لئے مُضر ثابت ہوئی۔ کیونکہ اُس کی مصروفیات مہندر کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ پھر اُن دونوں کی حیثیت میں بھی اب بڑا فرق ہوگیا تھا۔ وہ ایک دولتمند باپ کی بیٹی تھی، گویا دہکتا ہوا آہن، اور مہندر ایک غریب ماں کا بیٹا تھا۔ جیسے بھیگی ہوئی مٹی! لیکن یہ انقلاب بعد میں ہوا، بچپن میں نہیں، جب وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب کیے گئے تھے۔ شادی ہوجانے کے بعد مُفلسی نے ڈیرے ڈالنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ اس کا باپ سرگباش ہوگیا اور صرف ماں تن تنہا اپنے بیٹے کو کبھی نہ کبھی خوش بخت و مسرور دیکھنے کی آرزو میں جیتی رہی۔

مہندر کو اپنی خودداری پر بڑا ناز تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے غرورِ نفس پر تقدیر کی ٹھوکر کھا کر بھی اعتراف شکست کرے۔ لیکن یہ اَمر اُس کے لئے انتہائی اذیت رساں تھا، کہ کنول، جو پہلے بھی اس کی طرف کچھ زیادہ مائل نہیں تھی، اس کے اچھے دنوں کے پھر جانے کے بعد سے اور بھی فرنٹ ہوگئی ہے۔ وہ کسی طرح اُس کے سمجھائے نہیں سمجھتی۔ کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔ وہ اپنی دلبستگی کا سامان ہمیشہ گھر سے باہر ڈھونڈتی ہے اور اکثر و بیشتر سہیلیوں، سیر تماشوں، اور رقص و سرود کی محفلوں میں مصروف رہتی ہے۔ اُس نے اسے بہتیرا روکا، خوشامد کی، خفا تک ہوا۔ مگر کنول نے ہر بات سُنی ان سُنی ایک کردی۔ پَر اس سے زیادہ وہ کر کیا سکتا تھا؟ اونچے گھرانے کی بیٹی بیاہنے سے تو یہی ہوتا ہے!۔ کنول کے ماں باپ سمجھتے کہ گھر داماد ملا ہے۔ گویا بے داموں کا غلام، جسے اپنی مالکن کے رکھ رکھاؤ اور کاموں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اسکی طرف ٹیڑھی آنکھ بھی کرتا تو اُسے فوراً محسوس ہوتا کہ کنول کے ایک چھوڑ کئی کئی حمائتی موجود ہیں اور خود وہ کیا کچھ کم، یا دبیل ہے؟ آخر اس نے اپنے خیالات اور کنول سے تعلقات کا تجزیہ کیا اور اسی نتیجہ پر پہونچا کہ وہی کمزور ہے۔ اسی کی طرف

پانی مرتا ہے۔ کنول سے وہ نہیں ٹکرا سکتا۔ بلکہ اس سے الجھنا اپنی ہی تذلیل اور مزید ناخوشگواری پیدا کرنا ہے اور پھر اس قدر بڑھتی ہوئی آزادی کا وہ خود بھی تو ذمّہ دار ہے! شادی کے کافی عرصے کے بعد تک وہ نئی دُلہن کے چونچلے جو بگھارتا رہا! اس کی ہر جائز و ناجائز حرکت کو اُس نے سر آنکھوں پر رکھا، اور زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے کو روشن خیالی جانا بلکہ اکثر خود اُس نے اصرار کیا کہ موسیقی میں جو اُسے کمال حاصل ہے اُن کا مظاہرہ وہ زنانہ جلسوں اور خیراتی تماشوں میں کیا کرے، اور نفس تحت الشعور اس کے اس طرح مقبول اور محبوب خلائق ہونے سے وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ پھر وہ کس منہ سے کنول کو مجرم قرار دے؟ مغرب پرستی اور فیشن کے شوق میں خود اُسی نے تو حرم کی چلمنوں کی تیلیاں توڑی تھیں، اب وہ کیونکر اُسے منع کرے کہ یوں بے پروا اور آزاد پھرنا ہم مشرقیوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اور پھر یہ کنول پر ظلم بھی تو ہوگا! وہ رسوئی کے دھوئیں اور جھاڑو کی دھول سے متنفر ہے۔ گھر کے کام کاج کو ہاتھ لگانا اس کی شان کے خلاف ہے میاں کی خدمت اُس کے بس کی بات نہیں۔ پھر وہ نازوں کی پالی، جسے ہر اچھے بُرے فعل کی ماں باپ محض اسلئے شہ دیتے رہتے ہیں کہ وہ خوش رہے، کیسے مسلمان بیبیوں کی مانند گھر کی چاردیواری میں مقید ہو جائے؟ اس کی آنکھیں سینما کے محبت بھرے فلموں، بازاروں کی چہل پہل، دُکانوں کی رونق، دوست احباب کے تابناک چہروں، تفریح گاہوں کے دلچسپ مناظر، مسجد و مندر کی نورانی برجیوں اور سنہری کلس دیکھنے کی جو عادی ہیں! اس کے کان ہر دم ساز و لحن کے شیریں نغموں، ہر وقت طربناک باتوں، ہر گھڑی اپنے کمال کی مسرور کن داد اور ہر لحظہ ہنسی مذاق کے جو منتظر رہتے ہیں!

بیشک وہ کچھ نہیں کر سکتا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بے روزگار ہے اس کا تمام اثاثہ ختم ہو چکا ہے۔ شادی کے تین چار ہی سال کے اُلٹ پھیر میں وہ امیر سے غریب بن گیا ہے۔ اسلئے کنول پر اُس کا زور چاتا رہا ہے۔ اُسے ڈر ہے کہ اگر اُس نے زیادہ

سختی کی تو وہ برہم ہو جائیگی - کیا خبر وہ اُسے مفلس اور قلاّش ہونے کا طعنہ دیدے اور کہے "تم اپنے کو سمجھتے کیا ہو؟ جاؤ میرا تمہارے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا!" پھر کیا ہوگا؟ وہ اُسے چھوڑ بھی تو نہیں سکتا - اُسے اُس سے بیحد محبت ہے، اُسے دیکھکر اس کا چلّوؤں خون بڑھتا ہے ..... آخر اُس کی سمجھ میں یہ تجویز آئی کہ وہ عارضی طور پر کہیں باہر چلا جائے اور وہاں پتھر کا لاپروا اور بے اثر دل رکھنے والی دیوی کو خوش کرنے کے لئے دولت جمع کرنے کی کوشش کرے - اُس کے اس طرح دور رہنے سے کنول ضرور رحیم ہو جائے گی اور پھر وہ روپے کے زور سے، اس روپے سے جو خود اُس کا پیدا کیا ہوا ہوگا، کنول کے والدین کا نہیں، وہ اس کا منہ کیل سکتا ہے - پھر اُسے دبنے کی ضرورت نہیں ہوگی -

سوچ جتن کرنے کے بعد اُسے کلکتہ میں ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت ملی، اور وہ اپنی ضعیف ماں کو لیکر وہاں چلا گیا - کنول حسب توقع ساتھ نہیں گئی والدین کی لاڈلی بھلا جاتی بھی کیوں؟ ڈیڑھ سو روپلی میں ہوتا کیا ہے؟ تنخواہ معقول ہو جائے تو بیشک وہ اس کے ساتھ رہنے کے متعلق سوچے گی - ابھی تو تیل کی دھار دیکھنی باقی ہے -

——— لیکن افسانہ نگار یہ خشک باتیں کیا لے بیٹھا؟ افسانے کی دلکش فضا میں وہ نثر کے ان غیر دلچسپ ٹکڑوں کو کیوں سمو رہا ہے!

میں ہاری!

راتوں کو تصور اُن کا ہے اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے

طائر خیال پھر بھٹکا! اور افسانہ نگار کا ذہن ایک بار اور اُسی شب کا جائزہ لینے لگا جب اس خیالستان کی اپسرا، نازک بدن کنول نے دیوداسی کے روپ میں رقص و موسیقی کے کمالات دکھائے -

گھر پہونچکر وہ سیدھی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ آج اسپر ایک ناقابل کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتی کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ مکیش کے الفاظ میں جانے کیسا تاثیر تھی کہ اُسے یہ خیال بار بار ستائے جا رہا ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت ہے۔ حالانکہ اس سے پیشتر کبھی بھول کر بھی اُس کے دل میں ایسی کمزور بات نہیں آئی۔ قدآدم آئینے میں اُس نے اپنا سراپا دیکھا اور ..... اور، مکیش نے تو واقعی اُس میں ایک فتنہ جگا دیا ہے۔ یہ لانبے بال، نرم رخسار، احمریں لب، سڈول باہیں۔ چھریرا بدن، بھری بھری پنڈلیاں، یہ سب قیامت نہیں تو کیا ہے! اُسے ایسا محسوس ہوا کہ غرورِ حُسن اس کی رگ رگ میں آہستہ آہستہ سر اُٹھا رہا ہے۔ وہ ایکا ایکی گھوم گئی، کمرے کی ہر شے اُسے حسین معلوم ہو رہی تھی۔ دریچے میں سے باہر کے ہرے ہرے درخت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کیا اُن پر بھی وجد طاری ہو گیا ہے؟ وہ کھڑکی کے پاس آگئی اور خیالات کی تیز رَو نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ وہ یقیناً حُسن کی دیوی ہے، دیوی! ۔ اور دیوی کے بے شمار پُجاری ہوتے ہیں!۔ لیکن وہ ہر پُجاری پر مہربان نہیں ہوتی۔ اُس کی نگاہ انتخاب صرف ایک بھگت پر پڑتی ہے۔ جو سب سے زیادہ پُرجوش ہو۔ تو پھر اُس کا پُجاری کون ہے؟ کہاں ہے وہ پُجاری، جو اپنے جذبات کے طوفان میں تمام بندھنوں کو توڑ پھینکے، تمام رکاوٹوں کو کُچلتا چلے اور اپنی بھگتی سے دیوی کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے استھان سے اُتر کر خود اُس کے پاس چلی آئے۔ اور کہے "مانگ پُجاری، مانگ! تیری مراد پوری کی جائیگی۔ تو میرا ہے" ہاں تو وہ پُجاری کون ہے؟ مہندر! نہیں، نہیں، وہ پُجاری نہیں ہے۔ وہ تو مندر کا منتری ہے۔ جسے پوجا پاٹ مجبوراً کرنی پڑتی ہے۔ دیوی کے چرنوں میں وہ خود تھوڑی آیا ہے۔ اُس نے تو اپنے ماں باپ کی مرضی پوری کی ہے مکیش؟ اس کے کان گنگ ہونے لگے۔ یہ نام کس نے لیا؟ کیوں لیا؟۔

باہر شیشم کے درخت پر کوئل کہے جا رہی تھی "مکیش! مکیش!! مکیش!!!"

یہ سچ ہے کہ اس سے گھر میں نہیں ٹکا جاتا تھا اور وہ ہر وقت، ہیموں کی طرح، محض تفریح طبع کو مقصد حیات سمجھتی تھی، لیکن مشرقی خون اپنا رنگ بالکل تھوڑی بدل دیتا ہے——

——اس میں ایک کمزوری (؟) تھی جو اس کے طور طریق دیکھتے ہوئے اس کے خیالات کا، گویا ضد تھی۔ اور یہ کمزوری تھی اس کی نسوانیت کی، یعنی کبھی کبھی اس کے دل میں مادریت کا جذبہ بے اختیار پیدا ہو جاتا اور وہ تمنا کرتی، کاش اُس کا کوئی بچہ ہوتا! اس کی گود بھری پُری ہوتی! اُس کا مُنّا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسکے چہرے اور چھاتیوں کو ٹٹولتا اس کے پیٹ اور رانوں پر اپنی بھول سی لاتیں چلاتا۔ یہ معصوم چوٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی! اگر اس کا بچہ ہوتا اور وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچتی تو کیسا اچھا لگتا! اور جب وہ ماتا کے جوش میں اُسے طرح طرح کے بے معنی ناموں سے پکارتی، وہ روٹھتا یہ مناتی، وہ بھوک سے روتا یہ دودھ پلاتی، وہ کپڑے خراب کئے جاتا یہ خوشی خوشی بدلے جاتی، وہ اپنا منہ سانتا، یہ دھلاتی اور اس کے بھولے مکھڑے کو ان گنت پیاروں سے لبریز کر دیتی تو نہ جانے اُسے کیسی بے پناہ لذت محسوس ہوتی!——لیکن وہ تو اس نعمت سے محروم ہے۔ یہ بیش بہا دولت تو اُسے عطا ہی نہیں کی گئی۔ شادی کو چار سال ہو جائیں گے مگر مہندر نے اسکے دل کے اندر کی آواز نہیں سُنی یا سُنی تو وہ اُسے زندگی کا یہ سب سے بڑا تحفہ کیوں نہ دے سکا؟

آخر اُس کے مادرانہ جذبے کا اظہار مکیش کے طوطے کو پڑھانے میں ہوا، جو مکیش نے اُسے گذشتہ ماہ تحفتاً پیش کیا تھا۔ وہ اُس کے لئے خود بازار سے ایک سُنہرا پنجرا خرید کر لائی۔ اور اُس کے دانے پانی کے لئے طوطے کے شایانِ شان، اُس نے اُس میں خوبصورت کٹوریاں رکھیں اور جب سے یہ ہیرا من اُس کے گھر آیا کنول کا باہر آنا جانا کم ہو گیا۔ اب اُس کا زیادہ تر وقت اس کی دیکھ بھال، اُس کو دانہ کھلانے، پانی پلانے، اس کی اچھی اچھی باتیں سننے،

اور ایک نیا لفظ سکھانے میں صرف ہوتا - ہر روز صبح وہ اُسے پڑھاتی اور میاں مٹھو ایک ضدی فلسفی کی طرح اُس کے لفظوں کو پہلے غور سے سُنتے کہ وہ سننے کے لایق بھی ہیں یا نہیں، اور پھر دُہرانے کی کوشش کرتے، لیکن اُن کی زبان لڑکھڑا جاتی اور وہ گویا خفا ہو کر گردن پھیر لیتے، مگر کنول ہمت نہ ہارتی - آخر مٹھو میاں نے یہ لفظ سیکھ لیا - اور جب وہ لہک کر کہتے " میرا مُنّا!" تو کنول پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی -

رات آدھی جا چکی تھی - آسمان پر کہکشاں سہاگن کی مانگ کی طرح نکلی ہوئی تھی - جا بجا ستاروں کے جھُمکے چمک رہے تھے اور برسات کا بھیگا ہوا چاند اپنی پوری تابانی سے ضوفشاں تھا - صاف و شفاف تالابوں کی سطح پر کنول کے چوڑے چوڑے سبز پتّے تیر رہے تھے - گھاس کی لمبوتری پتّیاں بارش کے آخری قطروں کے بوجھ سے برکھا کی ٹھنڈی ہواؤں میں اِس طرح جھوم رہی تھیں جیسے دوشیزگانِ بہار مینا بدوش کسی مغل شہزادے کے عشرت کدہ میں رقص کرنے چلی ہیں - اور آموں کے درختوں میں پپیہے پیہو پیہو کی رٹ لگائے جا رہے تھے - کنول مرغابی کی بچھڑی ہوئی مادہ کی مانند مضطرب و غمگین اپنی خوابگاہ میں ٹہل رہی تھی - کئی کئی راتوں سے اس کا یہی حال تھا، گویا ابتدائے شب سے لیکر سحر کے طلوع ہونے تک، فراق کی صعوبتیں اُسے آتش زیرپا رکھتیں - اور آج تو برشگال کی ہنگامہ خیزیوں نے اُس کے جذبات خفتہ بیدار ہی کر دیئے اور اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ کاش اس سمے جبکہ ساری کائنات ایک نغمۂ نور بنی ہوئی ہے کہیں سے وہ جانِ تمنّا نکیش آجائے! اِسی لئے اس کی نیند اُڑ گئی تھی اور وہ بے بس و مجبور، دیوانہ وار کبھی یہاں بیٹھتی، کبھی وہاں، کبھی ٹہلتی، کبھی دریچے میں سے جھانکتی ...... ارے! یہ، یہ کون؟ پائیں باغ میں چوروں کی طرح کون چلا آتا ہے؟ -

جیسے شیکسپیر کے تخیل میں رومیو اپنی جولیٹ کے فراق میں جا ہی وانڈر منسکر

چلا آیا تھا، یا جس طرح کسی الف لیلوی داستان میں کوئی حوصلہ مند شہزادہ حصول محبوب میں حرم کے مستور سے مستور حجلے میں داخل ہونے کی سعی کرے، مکیش بے خوف وخطر، دیوار پر چڑھ رہا تھا۔ جب وہ دریچے تک پہونچا تو کنول نے فوراً اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور وہ ان کے سہارے، دبے پاؤں، اندر آگیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور کنول کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی، جیسی اُس شیر خوار بچّے کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے جو ایکا ایکی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ مگر اپنے آپ کو ماں کے آغوش میں محفوظ پاکر پھر اطمینان سے سو جاتا ہے۔ وہ اُس کے اور قریب آگیا اور اس کی چشمہائے سرگیں اُسے ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے وہ دو چھوٹے چشمے ہیں جن میں جل پریاں غسل کرکے اکتسابِ حسن کرتی ہیں۔

کنول کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، گویا اس کے جذبات کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گے۔ کچھ دیر وہ دونوں نیچی نظریں کئے خاموش بیٹھے رہے۔

—— دوسرے لمحے افسانہ نگار نے ایک نیا منظر دیکھا۔ مکیش اس کے نرم ونازک جسم کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا اور کنول کی نرگسی آنکھیں محبت کی شدّت سے چمک رہی تھیں، جس نے اُسے غمِ دنیا سے آزاد کرکے گویا خواب کے جزیرے میں پہونچا دیا۔ جہاں کسی کی پرواہ نہیں، کوئی ممانعت نہیں۔...... جذبات نے ان کو مغلوب کر دیا اور وہ دونوں اُس کے تیز بہاؤ میں بہے چلے گئے۔ وہ شکستہ سانسوں میں کہتا رہا "کنول! میری کنول! آخر تم مجھے مل گئیں! تم میری ہو، میری ہو، ہو نا؟"

—— لیکن یکایک گھنٹے نے چار بجائے جس سے وہ چونک پڑی۔ یہ کیا ہو رہا ہے وہ دیوانی سی کیوں ہوئی جا رہی ہے؟ وہ تو بیاہتا ہے کیا وہ اپنے شوہر کا اعتماد یوں پاش پاش کردیگی؟ ۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئی اور جب بھی وہ مکیش کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کرتی، وہ اُسے اور بھی قریب کھینچ لیتا۔ وہ کیوں نہ اُسے اپنے دل سے لگائے؟ وہ سمجھتا ہے کہ اس عورت کی روح ازل ہی سے اسکی روح کی رفیقہ ہے اور ان دونوں

کی روحیں اب اس طرح آپس میں متحد ہوگئی ہیں جیسے دو ندیاں سنگم پر مل جاتی ہیں - اور پھر کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتیں - کوئی بتا دے - محبت کیا ہے ؟ - گناہ یا ایک قدسی صفت ؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو بے شک وہ دونوں قابلِ تعزیر ہیں ، لیکن اگر محبت انسانی عروج کا منتہا ہے تو کیا پھر بھی وہ اُس کی پکار کو نہ سنیں ؟ - کیا آپ کا جواب سماج اور رواج پر مبنی ہے - یعنی انسانی قانون پر ؟ خُدائی پر نہیں ! اگر وہ ایک دوسرے کو چھوڑ دیں تو کیا وہ زندگی کے تانے بانے میں سے محبت کے سنہرے تار کو ضائع کر دینے کے مجرم نہ ہونگے ؟ -

کنول کے جذبات کی روا یکا ایک رُک گئی - اُس کا خیال ٹھٹک گیا ، اور وہ دریچے میں سے چاند کو دیکھنے لگی - جو اپنی گولائی چھوڑ کر دوسری ہیئت اختیار کر رہا تھا - اے لو ، وہ قلب کی صورت میں ڈھل گیا ، گویا رخِ فلک پر خود محبت متشکّل ہو کر نمودار ہوئی ہے ! مکیش نے اسے اپنی گرفت میں لیا اور گویا خواب سے چونک کر وہ اس کے محبت سے چہرے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں اشتیاق کے ساتھ ساتھ التجا بھی تھی - گویا وہ کہہ رہی ہے " مجھے چھوڑ دو " لیکن مکیش نے اس التجا کو نہیں سُنا - وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں - ایک دوسرے میں سما جائیں ، اور کم از کم اس لمحے اُن کے درمیان کسی قسم کی غیریت حائل نہ ہو - آخر کنول کے تن من میں ہیجان بپا ہو گیا اور اُس پر شراب کی سی مستی چھا گئی - اب ان نگاہوں میں کشمکش نہیں تھی گویا وہ ہار مان چکی ہے - لیکن مکیش کی آنکھوں میں شعلے کیوں بھڑک رہے ہیں ؟ کیا اِس وقت وہ ماضی یا بندیوں کو توڑ کر محبت کے شہر میں پہونچ گئے ہیں جہاں ہر طرح عشرت و امان ہے ؟ -

کس قدر شیریں تھا یہ مختصر عرصہ! ——— جب اسپر فتح پالی گئی اور جذبۂ محبت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُسے، اس کے محب کے دامن سے وابستہ کردیا! ——— لیکن اس کے ساتھ ساتھ ندامت اور دُکھ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، دبے پاؤں، ہولے ہولے اس کی طرف بڑھتے آئے!۔

الوداع

آج وہ بھی بجھ گیا، لو ہو گیا قصّہ تمام
ٹمٹما تا رہ گیا تھا، جو چراغ آرزو

مہندر کے گھر سے ملواں، کریم بخش کا مکان تھا۔ یہ مسلمانوں کے کوئی بڑے مولوی تھے۔ گھٹا ہوا سر، کتری ہوئی لبیں، مٹھی بھر ڈاڑھی، موٹے تازے، توند نکلی ہوئی، لباس بھی مولویانہ، نیچا کرتہ، اونچا پاجامہ، گویا چلتی پھرتی حدیث و شرع! عوام میں ان کی بہت عزت تھی۔ بڑے بڑے تجار اُن کے ہاتھوں کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے تھے۔ اور جب پرو کہیں مہربان ہوتے، تو وہ سمجھتا کہ اُس کی قسمت پھر گئی ہے، لیکن اُن کے زنانخانے میں، جو کھڑکی میں سے صاف نظر آتا تھا، آئے دن ایک عجیب تماشہ ہوتا، جسے دیکھ کر مہندر کے تعجب کی انتہا نہ رہتی۔ مولوی صاحب کو کسی کل چین نہیں تھا، وہ اپنی بیوی پر ہر طرح کا ظلم روا سمجھتے بلکہ ہاتھ تک اُٹھانے سے نہیں چوکتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر اُن کی تیوریاں چڑھ جاتیں اور بیوی کا خون خشک ہو جاتا۔ سہم کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی اور اُن کی ایسی جھڑکیاں سنتی کہ میم ہو تو مُنہ نوچ لے۔ مگر مولوی صاحب کے اس ننگ انسانیت طرزِ عمل کے باوجود بھی، وہ بیچاری ہر دم اُن کی خوشنودی کی متمنی اور ساعی رہتی اور کوئی دقیقہ ایسا نہ گذرتا جب وہ میاں کی خدمت اور فرماں برداری سے جی چُراتی ہو مزید

بران، میاں ذرا سیدھے مُنہ بات کرلیں یا اس کی خوش نصیبی سے ذرا ہنس بول لیں تو گویا اُسے جنت مل گئی، خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی ..... مہندر کے خیالات کو مہمیز لگی۔ تمام اگلی پچھلی باتیں آناً فاناً اس کی نظروں کے سامنے پھر گئیں۔ دنیا کے ہجوم میں وہ کہاں کھڑا ہے؟ اپنے ساتھی پر اُسے کیوں اختیار نہیں؟ ہوتے ہوتے وہ اپنے اور کنول کے تعلقات پر، دل ہی دل میں بحث کرنے لگا۔ وہ خوبصورت اور ناشکری ہے اُس نے اِس کی محبت اور درگذر کا جواب ہمیشہ سرد مہری سے دیا۔ اُس کے دل میں اس کی کوئی عزت اور محبت نہیں۔ اسی لئے نا کہ اُس نے ہمیشہ شرافت برتی؟ کیا وہ بھی انہی مولوی صاحب کی طرح اُسے دبا کر رکھے؟ سر اُٹھانے کی نوبت ہی نہ آنے دے؟ اُسے اپنی حالت پر بے حد رنج ہوا کہ وہ اب تک اس قدر کمزور کیوں رہا۔ آخر کو تو وہ مرد ہے، کنول کا شوہر! غلام نہیں۔ اُسے مہندر کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیئے۔ پھر اُسے جلال آگیا۔ کنول اُس کی شرافت اور انسانیت سے ناجائز فائدہ کیوں اُٹھا رہی ہے؟ بس، اب وہ اسے یوں کھُلے بندوں نہیں چھوڑ سکتا۔ اگلے مہینے رخصت لیکر وہ کنول کو زبردستی اپنے پاس گھسیٹ لائیگا۔ بڑے بوڑھوں کی کہاوت غلط تھوڑی ہے۔ کھلائے سونے کا نوالہ دیکھے شیر کی نگاہ! ان عورتوں کو ہمیشہ قابو میں رکھنا چاہیئے۔ ورنہ وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ بیشک عورت تیتری ہے۔ جس کے پر شیطان کے اور جسم فرشتوں کا ہے۔ پروں کو آزاد چھوڑ دو اور وہ اپنے آپ کو اُن کے بل پر اُڑاتے اُڑاتے مرد کے قبضہ سے نکل جائیگی ....

لیکن کیا وہ سچ مچ کنول کو گھسیٹ کر لا سکتا ہے؟ اس میں اتنی ہمت ہے؟ وہ اپنی مردانگی کا ثبوت دے سکتا ہے؟ اُس کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ اس کو یوں بیدردی سے گھسیٹ لائیگا۔ اس کی صرف ایک سرد اور گھورتی ہوئی نگاہ اُس کا تمام زور اور عزم پگھلا کر رکھدے گی۔ وہ گھبرا گیا " یہ ہے اس زمانہ کی تعلیم یافتہ عورت"

وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "مجھے چاہیئے تھا کہ شروع ہی سے اُس کو یہ ڈول نہیں ڈالنے دیتا —— لیکن اب وہ مجھ پر حکومت نہیں کر سکتی - وہ میری بیوی ہے، میری دست نگر! عورتوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک کرنا چاہیئے جس سے انہیں مرد کی برتری اور اپنی محکومیت کا احساس ہوتا رہے۔"

تقدیر نے ایک نیا گل کھلایا - ڈیڑھ سو روپے کا کلرک سوا پانسو کا ڈپٹی ڈائرکٹر بنا دیا گیا - مہندر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی - لیکن اس خوشی میں استہزا کی بھی ایک جھلک تھی - اب تو سسرال میں کوئی اُس پر انگلیاں نہ اُٹھا سکے گا! وہ ہر طرح کنول کے شایانِ شان جو ہے! سوسائٹی کی نظر میں اُس کے شوہر کا درجہ کتنا بلند ہے! اب اُس کے ماں باپ کو بھی اُس کے بھیجنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا - روپے کی جھنکار میں خدا نے کتنی دلکشی پنہاں کی ہے! —— وہ اُسی روز کنول کو لانے کیلئے روانہ ہو گیا۔

مکیش کو کنول کی یکایک تبدیلی پر تعجب ہے - آخر وہ اس سے اب کیوں نہیں ملتی؟ ڈھائی تین ماہ ہونے کو آئے، اس شب ماہ کے بعد سے، جب اُن دونوں نے وہ سنہری ساعتیں گذاریں، باوجود کوشش مکیش کو کنول کی جھلک تک نظر نہ آئی - وہ ہمیشہ ٹالتی رہی - کوئی نہ کوئی عذر نکل آیا - پھر آج اُس نے اُسے کیوں بلایا ہے؟ - کیا اسکی قسمت جاگنے والی ہے؟ -

وہ پہر ڈھلے، پچھلے دروازہ سے، اُسی دیوار کے سہارے اندر آ گیا - رات اپنی روایتی تاریکی اور سائے کے جلو میں زمین و آسمان پر پھیلی ہوئی تھی - مسہری کے سرہانے ایک مدھم سا لیمپ روشن تھا اور کنول گل پژمردہ کی مانند، دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے بے آرام بیٹھی ہوئی تھی - ایک لمحہ کے لئے اس کی سسکیوں سے دُور دُور تک

چھائے ہوئے سکوت میں ذرا سا خلل ہو جاتا تھا، جیسے ساکن پانی میں ایک کنکر سے ننھی ننھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مکیش اُس کے قریب خاموش بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے آہستگی سے بولا "کنول! تمہیں ہُوا کیا ہے ——؟"

"کچھ نہیں" اُس نے ساڑھی کے پلّو سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اور بھی دبی زبان سے جواب دیا" میں کلکتے جا رہی ہوں......"

"کلکتے؟" اُس کے مُنہ سے استعجاب میں نکلا" کب؟ کیوں؟ کس کے ساتھ؟"

"کل صبح مہندر آ رہے ہیں"

"—— لیکن تم اُس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں۔ اُس سے تو زبردستی......"

اُس نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "بھاگ کے لکھے کو کس نے مٹایا ہے؟ خیر، جانے دو ان باتوں کو۔ آؤ ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ لیں کہ آج ہم تم جدا ہوتے ہیں —— ہمیشہ کے لئے!"

"ہمیشہ کے لئے!" مکیش کا کلیجہ دھک سے ہو گیا، جیسے چکور کو یقین ہو جائے کہ وہ چاند تک نہیں پہونچ سکتی۔" آخر کیوں؟ کیا اب ہم کبھی نہیں ملیں گے؟"

"نہیں مکیش —— ہم دونوں کی جُدائی کا وقت آن پہونچا ہے...... لیکن تمہاری نشانی ہمیشہ میرے پاس رہے گی!" اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور بے اختیار اُس کا دایاں ہاتھ اُس کے دل پر چلا گیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ——!

مکیش نہیں سمجھا۔ شاید وہ مٹھو کو کہہ رہی ہے!۔

وہ اپنی روحانی بے چینی اور گریۂ مسلسل کو ضبط کرنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دونوں آہستہ آہستہ دریچے تک آ گئے —— سامنے اِس نیم کے اندھیارے درخت کے نیچے سنگ مرمر کے حوض والی روش دو مخالف سمتوں میں تقسیم ہوتی تھی۔

گویا انگشت قسمت نے اِن دونوں کے لئے الگ الگ راہیں تجویز کر دی ہیں۔ دونوں نے ایک ساتھ اِن پگڈنڈیوں کو دیکھا اور پھر معنی خیز نظریں ایک دوسرے پر ڈالیں۔ اُس کی گردن کے ایک جانب ڈھلکنے سے وہ اُس کا اشارہ سمجھ گیا اور باچشم گریاں آہستگی سے نیچے اُترا، اور وہ اُسے دُور تک دائیں پگڈنڈی پر جاتا ہوا دیکھتی رہی ـــــ بائیں ہاتھ والی روش کلکتے کی سمت جاتی تھی!۔

جیسے اُس کی روح، جسم کی تاریک کوٹھڑی سے آزاد ہو جانے کے لئے گھبرا رہی ہو، اس کا تنفّس یکلخت تیز ہو گیا، اور جب اُس نے بے اختیار ایک بار پھر ٹھنڈا سانس لیکر "میرے محبوب کی یادگار! ــــ" دُہرایا تو صحن میں لٹکے ہوئے ٹھٹھو کے پھڑپھڑانے اور زور زور سے چیخنے کی آواز آئی "میرا مُنّا!"

سنہ ۱۹۴۰ء

پنچھی

پارہتی، سونا کا سوال سُنکر شرما گئی۔
دونوں بہت پُرانی سہیلیاں ہیں۔ اور عنقریب ماں بننے والی ہیں۔ جب سے پارہتی اپنے دیس واپس آئی ہے، دونوں کی خوشی کی کوئی حد نہیں۔ برسوں کے بچھڑے یوں ایکا ایکی مل جائیں تو کون مسرّت سے دیوانہ نہ ہو جائیگا؟۔ ہمیر پور، ایک چھوٹا سا شہر نما گاوں ہے پارہتی کے میاں شادی ہونے کے بعد کئی سال تک دیس بدیس کی خاک چھانتے رہے مگر اب یہیں آپڑے ہیں۔ گھر کی روکھی سوکھی باہر کے تر مال سے بہتر ہوتی ہے۔ پھر اگر محنت کریں تو یہاں بھی کافی دھندہ چل سکتا ہے۔ آخر یہ اُن کی جنم بھومی ہے۔ جب باہر کے بے شمار لوگوں کا یہاں پیٹ بھرتا ہے تو یہ تو اپنے ہیں۔
سونا کی گدگدی سے، پارہتی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے اُس نے

اُس کے ہاتھ پکڑ کر کہا "اری ٹھیر تو ——— بتاتی ہوں"

اور جب اُس نے اُسے بتا دیا تو پھر اُس کی باری تھی۔ چنانچہ وہ اُس کے شکم کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی "اب تو بتا!"

سوُنا لجا گئی، نیچی نگاہوں سے مسکراتے ہوئے بولی "میں بھی ———"

پھر اُن دونوں نے آپس میں عہد و پیمان کر لیا کہ اگر ایک کے ہاں لڑکا اور دوسری کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اُن دونوں کی شادی کر دیں گے۔ اِس طرح دونوں سہیلیوں کی محبت اور بہناپا، اور زیادہ ہو جائیگا۔ یوں بھی، یہ شادی اِس بات کا ثبوت ہوگی کہ پاربتی اور سونا تعلقات اپنے تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتیں۔ بلکہ ان کی تمنا ہے کہ یہ تعلق اُن کے بعد بھی قائم رہے اور اس آرزو کے پورا ہونے کی اِس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ دونوں بیٹا بیٹی دیکر ہمیشہ کے لئے ایک مضبوط رشتے میں منسلک ہو جائیں۔

سونا نے جواب طلب انداز میں پوچھا۔ "تو پھر یہ بات پکّی ہو گئی نا؟"

"ہاں ہاں! پر تو تو اپنے قول سے نہ پھر جائے گی؟" پاربتی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

سونا نے اُسے گھور کر دیکھا، گویا خفا ہو رہی ہے "واہ ری پگلی! ——— تو نے مجھے ایسا سمجھا ہے؟ میں نے ہی تو یہ بات کہی ہے۔ اور میں ہی پھر جاؤں گی؟"

(۲)

بانسری کا سوز و گداز سے لبریز نغمہ سُنکر پاربتی کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اُس نے کھڑکی کھول دی اور بے چینی سے باہر دیکھنے لگی۔ آسمان کے شمالی گوشے میں دھنک نکل آئی تھی۔ اور قوس قزح کی جل پریوں جیسی رنگینیاں، فضا میں بارش انوار کر رہی تھیں۔ سامنے اسی جوہڑ کے کنارے، آم کے پیڑ کے نیچے، اس کا لختِ جگر، بیٹھا بانسری بجا رہا تھا اور

اُس کے زانو پر ٹھوڑی رکھے گیندی اُس کی خاموش نگاہوں کو تک رہی تھی۔

اِس سولہ سال کے عرصہ میں بے چاری پاربتی پر کیا کیا انقلاب گزر گئے؟ اس کا شوہر اس سے بچھڑ کر، روحوں کی بستی میں چلا گیا۔ اس کی سہیلی سونا دنیا سے روٹھ کر عناصر قدرت میں جا ملی۔ اب اُس کے جیون کا اُجیالا، اس کی کائناتِ حیات کا چراغ اُس کی زندگی کا سہارا بس یہ شیام ہے۔ پر ——— قدرت نے اسکی دکھیاری روح کو موت کی اُداسی، اور ایک بے پایاں خلش سے ہمیشہ کے لئے ہمکنار کر دیا ہے، کیونکہ شیام اتنا سُندر ہونے پر بھی بول نہیں سکتا۔ وہ سُن سب کی لیتا ہے۔ مگر خود اپنی بیتی کسی کو نہیں سُنا سکتا۔ وُہ غریب نطق سے محروم ہے۔ اسلئے کوئی نہیں جان سکتا کہ جب برسات کی سیاہ گھٹائیں آسمان پر مچلتی ہیں، جب کالی راتیں اُسے آگھیرتی ہیں، جب شام ہونے کے بعد گیندی کو مکان سے اکیلا نہیں نکلنے دیا جاتا تو وہ ساون بھادوں کی مانند کیوں آنسو بہائے جاتا ہے۔ کیوں آدھی آدھی رات کو وہ کوٹھے کی منڈیر پہ جھیل کے دہانے پر کھیتوں کی مینڈھ پر بیٹھا بانسری بجائے جاتا ہے۔ اس کی زبان اس کی دلی کیفیات کا اظہار کرنے سے قاصر ہے۔ اسی لئے وہ اس بانس کے ٹکڑے کے ذریعے اپنا دکھ درد بیان کر دینا چاہتا ہے۔ سننے والے انہیں نغماتِ نشاط نہ سمجھیں، یہ اُس شمع کے غمناک راگ ہیں جو پروانے کی الفت میں پگھل پگھل کر اپنی جان گھلا رہی ہے۔

شیام کی بےکسی اور مظلوم صورت دیکھ کر پاربتی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ سوچنے لگی۔ آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیا میرے لال کی قسمت میں بس یہی روگ لکھا ہے؟ اس کے علاوہ کچھ نہیں؟ کوئی سکھ نہیں؟ کوئی مسرت نہیں؟ اِس آسمان پر رہنے والے نے اپنی بڑائی اور مختاری جتانے کے لئے صرف شیام کو ہی کیوں چُنا ہے؟ کیا انسان فقط ظلم و مجبوری کا شکار ہو کر ہی خدا کو پہچانتا ہے؟۔

پاربتی نے ایک ٹھنڈا سانس لیکر کہا "آہ کیسی شبھ گھڑی تھی وُہ، جب میرے ہاں یہ شیام اور سونا کے ہاں گیندی پیدا ہوئی! کیسی کیسی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ شہنائیوں کی آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ مگر آہ! خوشی انسان کو ہمیشہ مہنگی پڑتی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ شہنائیوں کو سننے والے کان آج بانسری کے درد بھرے گیت بھی سنیں گے۔"

اُس نے غور سے دیکھا کہ شیام کے نمناک رخساروں کو گیندی اپنے ہاتھوں سے خشک کر رہی ہے۔ اُس کی معصوم نظریں کہہ رہی تھیں "شیام! میرے شیام! میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ تم پر جو کچھ بیت رہی ہے میں اُس سے ناواقف نہیں ہوں، برہ کی آگ میں ہم دونوں ساتھ سلگ رہے ہیں۔"

پاربتی نے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور خود ہی کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا تھوڑے دنوں میں برات آجائیگی اور گیندی دلہن بنکر چلی جائیگی ——— چلی جائیگی ——— میرے لال کو چھوڑ کر، دنیا میں یکہ و تنہا چھوڑ کر۔ کاش سُونا زندہ ہوتی۔ تو میں اُس سے جھگڑتی اور کہتی "کیوں بہن! میرا اور میرے شیام کا دل توڑنے کے لئے ہی تم نے بات نکالی اور وعدے وعید کئے تھے؟" مگر نہیں جھگڑنے کی نوبت ہی کیوں آتی؟ سونا کے ہوتے ہوئے اس رشتے کو جو دونوں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی تجویز ہو چکا تھا کسی کو توڑنے کی ہمت ہی نہ ہوتی، اور پھر اگر آج شیام کا باپ جیتا ہوتا تو کیا وہ گیندی کے باپ سے نہ لڑتا؟ کہتا "گوری سرن! ذرا معاملہ کو تو سمجھو۔ یہ رشتہ تمہاری بیوی کی پسند کا ہے اور ذرا میرے بچے کا تو خیال کرو۔ تمہاری ناانصافی سے اُس کی دنیا اندھیر ہو جائیگی۔ یہ دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ اکٹھے کھیلے اور پلے بڑھے ہیں۔ کیا ان کی محبت اور سلوک سے تم خوش نہ ہوگے؟ ———" مگر اب یہ باتیں کون کرے؟ جب انسان کا مالک ہی ناراض ہو جائے تو خوش قسمتی کے تمام آسرے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اُمید

کی تمام شمعیں بجھ جاتی ہیں اور مشیت اپنے کھلونے کی لپسپائی پر کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے۔

(۳)

گوری سُرن کا خیال بھی ٹھیک ہے۔ کوئی جان بوجھ کر تو اپنے دل کے ٹکڑے کو مفلسی کے چنگل میں نہیں پھنسا سکتا۔ جب سے گیندی کی ماں مری ہے اسکی چاہت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ اُسکی مرحوم بیوی کی نشانی ہے۔ بچپن سے اب تک اس نے اس کی بڑی خدمت کی۔ بڑی بڑی دقّتیں سہ کر اُسے پروان چڑھایا —— پھر بھلا وُہ اس کے لئے کیوں نہ بہتر سے بہتر بَر تلاش کرے؟ شیام کے باپ سے جب دکان نہ چل سکی۔ تو اُس نے کھیتی باڑی کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ وہی اس کے ورثہ میں آیا ہے۔ تھوڑی سی زمین، ایک ہل، دو بیل، من دو من اناج، بس یہی اُس کا کل سرمایہ ہے۔ فصلیں اچھی اُتر آئیں تو بے شک خوش قسمتی ہے۔ مگر ایسا ہوتا کب ہے؟ شاذ و نادر! ورنہ زیادہ تر تو کسان بچارہ بھوکا ہی مرتا ہے۔ دن رات ایک کر کے جوانی کا لہو پسینے کی طرح بہا کے، دُنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیوں سے منہ موڑ کر وہ صرف عمدہ فصلیں تیار کرنے کا متمنّی اور ساعی رہتا ہے —— وہ فصلیں جو اسکی ہو کر بھی اُسکی نہیں ہوتیں۔ گوری سرن کو معلوم ہے کہ قحط سالی میں بنی نوع انسان کے اِن سب سے بڑے خادموں پر کیا کیا بپتا پڑتی ہے۔ اُن کی آنکھیں آسمان والے سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہیں۔ انکے دل کال کے اندیشے سے بیٹھے جا رہے ہیں مگر بارش نہیں ہوتی، دھان اور گیہوں کے لہلہاتے کھیت جل کر تباہ ہو رہے ہوں تو ہوں۔ اور جب مینہ کی ضرورت نہیں ہوتی پانی کا ایک چھینٹا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ تو طوفان اور سیلاب اُمڈے چلے آتے ہیں۔ پھر کوئی اپنی بیٹی کسی کسان کو کیسے دیدے؟ نوکری میں لاکھ غلامی سہی، مگر مہینے کے مہینے ایک بندھی رقم تو چلی آتی ہے! بیمار پڑ جاؤ، یا چھٹی لے لو، تنخواہ پھر بھی ملے جائیگی۔ زمین جوتنے میں یہ بے فکری کہاں؟ گیندی سے جس کی شادی ہونیوالی ہے

وہ کسی جگہ ملازم ہے۔ گوری ہرن نے اسی لئے اسے ترجیح دی ہے وہ اور تمام باتوں کو نظرانداز کر بھی دے مگر اسے ہرگز نہیں کر سکتا کہ شیام، بات چیت سے محروم ہے۔ ——— اُس کی زبان گُنگ ہے۔

کل گونا ہے دوپہر تک بارات آجائے گی۔ نئے نئے لوگ ہوں گے اور ایک آدمی تو بالکل اجنبی، وہی جس کے ساتھ گیندئی کو تمام عمر رہنا ہے، ہاں اسی کے ساتھ گیندئی میکہ چھوڑ کر سُسرال بسانے چلی جائیگی۔ سارا گاؤں خوشیاں منا رہا ہے، سوائے ایک گھرانے کے، جہاں اس وقت سے جب بچہ بولنا سیکھتا ہے ہمیشہ سکوتِ مرگ طاری رہتا ہے۔ بچے بالے گوری چاچا کی ٹانگوں میں لپٹ رہے ہیں۔ گیندئی کی موسی اور دوسری عورتیں چھپا چھپ بیاہ کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ برہمن، پنڈت مہنت، اپنی اپنی توندوں پر ہاتھ پھیر رہے ہیں ——— مگر گیندئی کہاں ہے؟ شام ہونے کو آئی، جھٹپٹے کے سائے چاروں طرف پھیلنے لگے ہیں۔ سب لوگ ناچ اور گانے میں مصروف ہیں۔ اس لئے کسی کو خیال نہ آیا۔ اب ڈھنڈیا مچی ہے۔ گوری ہرن کا ماتھا ٹھنکا۔ اور وہ چُپ چپاتے ایک طرف کو نکل گئے۔

جھیل کے کنارے، جہاں کنول کے پھول اور ہار سنگار کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں، شیام اور گیندئی ایک جھاڑی کے پیچھے خاموش بیٹھے ہیں۔ اسکی بانسری خاک میں اس طرح پڑی ہوئی ہے گویا اب کبھی اس کے بجنے کی نوبت نہ آئیگی۔ اُس نے اُس کے چہرے کو، پُرمعنی نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت سی باتیں کہہ دیں۔

"گیندئی! تم تو کہتی تھیں کہ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی ——— کہیں نہ جاؤں گی، پر لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا واقعی ماپونے تمہارے لئے کوئی دولہا ڈھونڈ لیا ہے"؟

گیندئی نے اپنے آنسو پونچھے، اور چپکے سے سرگوشی کے لہجے میں بولی "شاموا

باپو کل مجھے بیاہ دیں گے اور آج کی شام پھر کبھی نہ آئے گی۔ میرے راجہ! تم آج تو کچھ بولو! کیا تم ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ بھی میرا نام لیکر نہیں پکار سکتے؟ آہ! تمہارے منہ سے، صرف ایک بار اپنا نام سننے کے لئے میں کتنی آرزو مند ہوں۔ پیارے شیام گھر والے مجھے تم سے چھڑا کر اندھیرے میں دھکیل رہے ہیں، تم مجھے پکارو، پکار کر اپنے پاس بلا لو۔ شیام ہو! کوئی اپنے ہاتھ میری طرف بڑھا رہا ہے، اچھی میری حفاظت کرو۔ مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ ...... شیام میں منتی کرتی ہوں ...... مجھے پکارو، ...... اپنے ہونٹوں سے صرف ایک دفعہ "گیندی" کہہ دو۔

شیام کی المناک آنکھوں میں حسرتیں ٹھنڈ گئیں جیسے وُہ غمناک آواز میں کہہ رہا ہو "میری رانی! میں مجبور ہوں، میں مجبور ہوں، میری زبان میں یارا نہیں، ورنہ میں تو تجھے سو بار، تیرا نام لے کر، پکارتا"

اُس نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اُسے تسکین دینے کے لئے اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ کنارے پر ایک کنول کا پھول ہوا میں اٹھلا رہا تھا۔ اُس نے اُسے توڑا اور چوم کر گیندی کے بالوں میں لگا دیا۔ گیندی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ سسکیوں کے ہجوم میں اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں "شیام! میرے شیام! ——"

"شیام!" گوری گرجتا ہوا سامنے آیا۔ جھٹکے سے گیندی کی باہیں شیام کے گلے سے ہٹائیں اور لکڑی سے شیام کو بُری طرح پیٹا۔ لیکن شیام نے اُف تک نہ کی ساری مار، منہ بند کیے، برداشت کیے گیا، مبادا کوئی، گوری کی عاقبت نااندیشی سے، شور و غل سن کر وہاں آجائے اور گیندی کی رسوائی کے چرچے ہوں۔ گیندی کے باپ کی اُس کے دل میں بڑی عزت ہے اسی گوری کی جس نے اِن دونوں کے جذبات، کا بالکل احترام نہیں کیا پھر وہ اس پر پلٹ کر

کیسے ہاتھ اٹھاتا؟ اُس نے تو اس کی مار کو روکا تک نہیں۔

گوہی، گیندی کو گھسیٹتا ہوا لے گیا اور جب گیندی نے بصد مشکل اُسے مڑکر دیکھا تو شیام کی انگلیاں ماتھے پر رکھی اور خون میں رنگی ہوئی تھیں۔

(۴)

چودھویں رات کا چاند، اپنی پوری تابانی کے ساتھ جگمگا رہا ہے اور ساری کائنات نور میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دیہات کی کیف پرور فضا میں برات کا ہر چھوٹا بڑا جھومتا جھامتا مگن چلا جا رہا ہے آگے آگے ڈھولک اور نفیری والے پیچھے پیچھے دولھا، اور اسکے پیچھے بہلیاں ہیں۔ دولھا کے جلو میں اُس کے ہمراہی ہیں۔ بہلیوں میں سسرال والیاں، اور سب سے آخری رتھ میں، باچی کی طرف دلہن اور سانگی کی طرف اُس کے ساتھ کی عورتیں ہیں۔ ڈھولک اور نفیری کی آوازیں سنکر گیندی کو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی نئی دلہن عالم شباب ہی میں مرجائے اور اس کے رشتہ دار اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اُٹھائیں، ارتھی میں اسکی لاش سرخ کفن میں ملبوس ہو اور عزیز و اقربا ماتمی باجے بجاتے ساتھ قدم اُٹھا رہے ہوں۔ گاؤں سے جاتے ہوئے وہ ہر اُس چپہ پر جہاں دونوں کھیلتے یا ملتے تھے؛ حسرت و یاس سے نظر ڈال رہی ہے کہ آج اُسکی محبت گاہ کا ذرّہ ذرّہ اُس سے بچھڑ رہا ہے۔

وہ سرنگوں، گم سُم بیٹھی تھی، پنگھٹ کے قریب جو شیشم کا درخت ہے اسے دیکھکر اس کا دل بھر آیا۔ یہ وہی پنگھٹ ہے جہاں وہ پانی بھرنے آتی تو شیام اس کے ہاتھ سے ڈول رسی لے لیتا اور گھڑا بھر کر خود اس کے سر پر رکھ دیتا تھا۔ یہ وہی شیشم کا درخت ہے جس کی چھاؤں میں اِن دونوں کے بچپن اور لڑکپن نے پرورش پائی۔ کبھی کبھی گیندی کتھہ اور چونا لاتی اور شیام شیشم کی پھلیاں توڑتا۔ پھر دونوں خوش ہو ہو کر، اُن میں کتھہ چونہ لگا کے کھاتے اور جب اُن کے منہ رچ جاتے تو دونوں ایک دوسرے کے

لبوں کو معصومیت سے تکتے رہتے۔ بارہا وہ شیشم کی شاخوں میں جھولی اور ڈالوں میں کھیلی ہے۔ پھر کیوں نہ اس کا پتہ پتہ اسے عزیز ہو؟ آخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے گھونگھٹ میں سے جھانک کر دیکھا ——— کہ شیام شیشم کے سہارے نعش کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ اُسکی نظریں فرطِ گریہ سے نیچی ہو گئیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔ پھر اس نے ایکا ایکی اُس کے ماتھے کو دیکھا۔ اس کی بھوؤں کے پاس زخم کا ایک گہرا نشان اُس کی مظلومیت کی داستان سنا رہا تھا۔ گاڑی آگے ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ چند لمحات میں یہ پنگھٹ، یہ شیشم اور یہ شیام...... سب نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

جذبات کے طوفان میں اُسے کسی کا خیال نہ رہا۔ گھونگھٹ سرک کر نیچے گر گیا۔ اور اُس نے اُسے آخری پرنام کرنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ ——— جن میں ایک مرجھایا ہوا کنول تھا ——— اُٹھائے۔ اُس کے جُڑے ہوئے ہاتھ اوپر اُٹھ رہے تھے۔ اور سر نیچے جھکتا آ رہا تھا...... ارے، یہ کیا؟ ایک بڑا سا پتھر پہیے کے نیچے آیا۔ گاڑی کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور...... گیندی کی پیشانی تختے میں سے نکلی ہوئی ایک لمبی کیل سے زور سے ٹکرائی۔ خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔

——— شیام کا دل دفعتاً انتہائی طاقت سے دھڑکا۔ گویا چراغِ سحری، بھڑک کر گل ہوا چاہتا ہے۔ اُس نے اُسے بھینچ کر پکڑا اور گاڑی کے مُڑتے مُڑتے ایک دم اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "گیں ——— دی!!"

پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ لگن کے سات پھیروں نے پنچھی کے پر کتر دیئے ہیں۔ وہ بیشک پرواز کرنا چاہتا ہے مگر قفس کی تیلیوں سے اُس کا مٹھی بھر جسم چھلنی ہو رہا ہے۔

شیام کی پکار فضا میں تحلیل ہو کر باجے گاجے کے شور میں گم ہو گئی اور پنچھی اپنے شکستہ پر پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء

لالۂ خودرو

رانا می نے مڑ کر دیکھا، پالنے میں اُس کا پھلروا سا لال ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یک بیک اُس کا تنفّس تیز ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔ باہر مینہہ رِم جھم رِم جھم برس رہا تھا۔ رات جوانی کی طرح مَست اور اسکی زندگی کی طرح کالی تھی۔ اس کے خیالات میں طوفان بپا ہو گیا۔ اگلے پچھلے واقعات پھر اُسے اپنے سے بیگانہ بنانے لگے۔ اُس نے دیوانہ وار بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگی۔ لیکن وہ بالکل خوف زدہ نہیں ہوا۔ بلکہ مسکرائے گیا۔ گویا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ اُس نے پھر اُسے پالنے میں لٹا دیا اور اُس پر جھک گئی، جیسے آج وہ اپنی ساری داستان اس معصوم شریک راز کو سُنا دیگی۔ بہت دیر تک وہ دل ہی دل میں کچھ کہتی رہی۔ اور بچہ بدستور کلیلیں کرتا رہا۔ آخر اُس کے خیالات خود بخود رک گئے۔ ماتا

جذبات تنفر و حقارت پر غالب آگئی۔ اور اس نے بے چارگی سے کہا "میرا منّا! ارے کوئی اسے دیکھے! اس کے مکھڑے پر کس قدر بھولپن اور پاکیزگی ہے! کون کہہ سکتا ہے، کہ اسے عالمِ وجود میں لانیوالا اس کا باپ نہیں؟"

پھر اس کے مستقبل کا خیال آتے ہی وہ لرز گئی۔ بیشک اس کے چہرے پر پھٹکار نہیں برسے گی۔ لیکن لوگ تو اسے ناجائز اولاد ہی سمجھیں گے۔ اور ان کا رویہ اس بے گناہ کے ساتھ کس قدر روح فرسا ہوگا؟

۳

آمی آبادی سے ذرا دور غریبوں کے محلے میں رہتی ہے۔ چند سال پہلے یہی غنچہ دہن زہرہ جبین بہت سے نوجوانوں کے دلوں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کا نازک بدن جوانی کے بوجھ سے جھکا رہتا اور مئے شباب اس کے ساغر حسن سے چھلکی پڑتی تھی۔ نہ جانے اس کے ہر گام پر کتنے سجدے تڑپتے تھے، کتنوں نے اپنا متاعِ عقل و ہوش اس کی اک ادائے مستانہ پر قربان کر دیا تھا اور اس کی ساقہائے سیمیں کی دید کے لئے نہ جانے کتنوں کی آنکھیں مچلتی تھیں۔ لیکن اس نے اپنا دامن سب سے بچانے کی کوشش کی۔ آخر کار ایک شکیل اور وجیہ نوجوان نے اسکے دل پر قبضہ کر لیا اور دونوں کے تعلقات حد سے گذر تے گئے۔ جوانی کی بغاوت رنگ لا کر رہی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکن میں ایک ننھی سی گونج اور پیدا ہو گئی ہے۔ پھر وہ نوجوان روپوش ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا وہ کون تھا خود آمی بھی اسے بھول گئی ہے یا شاید اُسے یاد آہی نہیں سکتا۔ اسے صدمہ جو اسقدر پہونچا ہے! تو قعات کو اس ظالم نے کتنی بیدردی سے پاش پاش کر دیا۔ وہ، کہ جو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار تھی، آج بالکل تباہ حال ہے۔ اس نے اس کا ساتھ عین منجدھار میں چھوڑ دیا۔ اس نے اسے کیسے کیسے سہانے خواب دکھائے تھے، کیسی

کیسی خوش آیند اُمیدیں دلائی تھیں۔ وہ محبّت کی بیقراریاں، وہ نباہ کے وعدے، وہ شبِ تنہائی کے قول و قرار، سب اب کسی بھولی ہوئی داستان کے اوراقِ پارینہ ہیں۔ پھر اُس کا دماغی توازن کیسے برقرار رہتا؟ لوگ کہتے ہیں وہ ایک مخبوط الحواس عورت ہے۔ جس کی نظریں ہمیشہ سامنے اور ٹھہری ہوئی رہتی ہیں۔ اُس سے کسی کو ہمدردی نہیں، سب اُس کو دھتکارتے ہیں۔ عورتیں تک اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ "آوارہ کہیں کی! یہ حرام کا بچہ اُس کے شرمناک افعال کا جیتا جاگتا ثبوت ہے"۔ لیکن وہ کسی کی پروا نہیں کرتی۔ لٹھّے کا تنگ پجامہ، سفید کرتا اور موٹا جھوٹا دوپٹہ اوڑھتی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا مرگئی ہے، سوائے دو ہستیوں کے، ایک اُس کا جگر گوشہ جس پر وہ جان چھڑکتی ہے۔ دوسرا ایک مرد جس سے وہ ہر وقت نفرت کرتی ہے۔ وہ بالعموم خاموش رہتی ہے۔ صرف جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بچّے سے باتیں کرنے لگتی ہے اور کئے جاتی ہے۔ وہ کچھ نہیں سمجھتا، پھر بھی وہ اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔

اب اُس کا حُسن خاک میں مل چکا ہے۔ سورج مکھی کی طرح کھلا ہوا چہرہ گلِ خزاں رسیدہ بن چکا ہے جس کی پتّیاں کملا کر جھڑ جاتی ہیں۔ جوانی رخصت ہو رہی ہے اور دل قبرستان کی طرح اُجاڑ ہو گیا ہے۔ وہ صرف ضرورت کے وقت باہر نکلتی ہے۔ مگر بلاوجہ کسی سے بات نہیں کرتی۔ پھر بھی بازاری لڑکے اور اوباش نوجوان اُسے بگّو دیوانی کہہ کر چھیڑتے ہیں۔

(۴)

بارہ سال اور بیت گئے۔ وہ بوٹا سا قدِ رعنا مائل بہ خمیدگی ہے۔ بڑھاپا عمر سے پہلے سر تا پا چھا گیا ہے۔ چہرے پر بے شمار جھرّیاں پڑی ہوئی ہیں جو ہر وقت غور و فکر، ہر لمحہ سوچ بچار، اور ہر گھڑی کے رنج و قلق کا اعلان کر رہی ہیں۔ وہ پہلے گم سم رہتی تھی،

اب کبھی ہنسنے اور کبھی رونے بھی لگی ہے۔ اس کا بچّہ ہوشیار ہو گیا ہے، نہایت ذہین، رحم دل، شریف (۔۔۔ اکیوں نہیں؟) اور اتنا ہی حسّاس۔ لیکن اماّمی اُس سے اپنے دل کی بات کبھی نہیں کہتی۔ خود دم گھوٹ رہی ہے، پر منہ سے بھاپ نہیں نکالتی نہ جانے انجام کیا ہو، مگر وہ یہ راز کب تک چھپا سکے گی، مارتے کے ہاتھ پکڑلو، کہتے کی زبان پر تو کسی کا بس نہیں؟۔

"ماں!" شیراز بسورتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اُس کے بال مٹّی میں اَٹے ہوئے تھے اور پھٹا ہوا کُرتہ بتا رہا تھا کہ کسی سے دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ اماّمی نے اُسے سینہ سے چمٹا لیا اور پیار سے بولی "کیا ہوا؟"

شیراز کی آواز روندھی ہو گئی "دیکھو۔۔۔ نوری کنجڑا مجھے روز تنگ کرتا ہے۔ ابھی میں اسکول سے چپ چاپ آ رہا تھا کہ اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا "حرامی ہے بے!!" یہ بڑی موٹی گالی ہے اماں! مجھے غصہ آگیا۔ مگر میں نے اس سے رسان میں کہا تم مجھے نہ چھیڑا کرو۔ لیکن وہ اب تب پر اُتر آیا اور گالی گلوج کرنے لگا اِس پر مجھے بھی غصّہ آگیا۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں بیٹا! لڑا نہیں کرتے" اماّمی نے ہولے سے کہا۔

"واہ۔ یہ سب تمہارا ہی قصور ہے" شیراز ذرا طیش سے بولا۔ سب لوگ تمہیں بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ آخر وہ دوسری عورتوں کی طرح تمہاری عزت کیوں نہیں کرتے؟"

اماّمی خاموش ہو گئی۔ شیراز نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور وہ سامنے دیکھ رہی ہے۔ اُس کی آنکھیں متوحش تھیں اور چہرے پر ایک رنگ آ اور ایک جا رہا تھا۔ اُس نے اُس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر دیئے "معاف کر دو اماں! مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ تم بھی دوسری ماؤں کی طرح

رہا کرو تاکہ لوگ تمہاری بھی عزت کیا کریں ——"

اماّمی اب بھی نہیں بولی - اُس کی نظریں سامنے اور ٹھہری ہوئی تھیں - شیراز ڈر گیا اماّمی کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور اُس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "شیراز! اب تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہوگئے ہو - مجھے تم سے سب کچھ کہہ دینا چاہیئے —— ورنہ ایک روز کوئی اور تم سے کہہ دیگا"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے الفاظ نہیں ملتے - آخر ہمت کرکے اُسنے کہنا شروع کیا "تمہارا باپ مرا نہیں - وہ زندہ ہے اور یہیں رہتا ہے"

"میرا باپ زندہ ہے!!" شیراز حیرت زدہ رہگیا "وہ کون ہے اماّں؟"

اماّمی سامنے دیکھتی رہی وہ اس وقت کوئی دوسری ہستی معلوم ہوتی تھی - شیراز کے سوال کا خیال کئے بغیر اُس نے پھر کہا "میں اُن دنوں محلۂ سوزن گراں میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور میرا گھر مدرسہ کے پاس تھا - اماں کے انتقال کے بعد میں اکیلی رہ گئی - اس وقت میرے پاس کبھی کبھار دو لڑکے آیا کرتے تھے - ایک میرا عم زاد بھائی اور دوسرا پڑوسن کا لڑکا، جو ہمیشہ چوری چھپے واں آیا کرتا تھا میرا عم زاد بھائی اب یہاں ایک مشہور وکیل ہے - میں اُس سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور اُس نے بھی مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہے - رفتہ رفتہ مجھے اس محبت نے دُنیا، مذہب، اور قانون سب سے انجان کردیا اور میں بالکل اُس کی ہوگئی - آخر ایک دن مجھے تمہارا علم ہوا اور میں ڈر گئی چنانچہ میں نے اُس پر زور ڈالا اور پھر خوشامد کی کہ شادی جلدی ہو جانی چاہئیے لیکن اُس کے تیور بدل گئے - محبت کے فسانوں کی جگہ خشک باتوں نے لے لی اور ایکا ایکی اُس نے آنا جانا بھی بند کردیا - کچھ دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ اُس کی شادی ہو رہی ہے - مجھ پر بجلی گر پڑی - مگر میں عورت ذات کر کیا سکتی تھی - خود غرض مرد - معصوم عورت کو

اسی طرح ادھر ہی چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے رب العزت کے آگے گھنٹوں رو رو کر دعائیں مانگیں اور اپنی سی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے ایک دوسری لڑکی سے شادی کر لی اور میں اپنی حسرتوں کا خون ہوتے دیکھتی رہی...... تم جانتے ہو جس بچّے کے ماں باپ کی شادی نہ ہوئی ہو۔ اُسے کیا کہتے ہیں؟"

غم و غصہ سے شیراز کا چہرہ لال ہو گیا۔ اُس نے چلّا کر کہا۔" اماں وہ کون ہے؟ مجھے اس کا نام بتا دو؟"

"ابھی نہیں"—— اماجی پر موت کی سی زردی کھنڈ گئی اور وہ کہتی رہی "—— میری نوکری چھُٹ گئی۔ بھلا ایسی عورت اُستانی کیسے رہ سکتی ہے جو بن بیا ہی ہو کر ماں بننے والی ہو؟ لیکن مجھے اِس کی بھی پروا نہیں ہوئی۔ میرے سر میں اس وقت صرف دو سودے سمائے ہوئے تھے۔ ایک تمہاری محبّت اور ایک تمہارے باپ سے نفرت۔ میں نے سوچ لیا کہ اُسے جیتے جی روحانی عذاب میں مبتلا رکھوں گی۔ میرا وجود اس کے لئے ضمیر مجسّم ہو گا۔ جو اُسے ہر دم اور ہر جگہ بے چین اور نادم رکھیگا۔"

اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ شیراز خوف زدہ ہو گیا کہ کہیں اُس کا دل نہ الٹ جائے۔

اُس نے پھر کہا۔" میں وہ مکان چھوڑ کر اس دس گھرے میں آ گئی۔ مہینے کے شروع میں ڈاکیہ لفافہ لایا۔ اس میں بیس روپے کے دو نوٹ تھے، گویا تمہارا باپ خدا کی حضور اپنا گناہ دھونا چاہتا تھا اور آج تک وہ اسی کوشش میں ہے۔"

"میرا باپ کون ہے اماں؟" اُس نے چیخ کر کہا۔ "اچھی مجھے بتا دو، میں اُسے جان سے مار ڈالوں گا۔"

شیراز کو جوش میں دیکھ کر اماجی نے اس کا سر سہلایا اور چمکارتے ہوئے کہنے لگی

"بیٹا! موت سے زیادہ اور بھی تو سنگین سزائیں ہیں اور وہ انہیں بھگت رہا ہے۔ اُس کا گھر سونا پڑا ہے، وہ اولاد سے محروم ہے۔ تم ہی اُس کے لڑکے ہو۔ مگر اُسے تم پر اب کوئی اختیار نہیں۔ سنو! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اُس سے کس طرح انتقام لیا جا سکتا ہے اُسے جان سے مار دینے کا خیال تو بالکل دل سے نکال دو۔ ورنہ اسے اپنے دکھوں سے نجات مل جائیگی۔ اور پھر خود تمہیں بھی لوگ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بجائے کوشش کرو کہ تم نہایت شریف اور اچھے آدمی بنو۔ اپنے میں وہ تمام خوبیاں پیدا کرو جن سے تمہارا باپ محروم ہے۔ اپنے تئیں اتنا بلند کرو کہ باوجود مجھ کلونتی کے دنیا تمہیں تمہارے باپ سے بہتر سمجھے۔ یہ باتیں اسکی زندگی اجیرن کر دینگی۔"

"لیکن ماں تم مجھے اُس کا نام بتا دو، پھر جو تم نے کہا ہے وہی کرونگا۔" شیرانو نے اماجی کے سینہ پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بچے!" اماجی اپنے آپے میں آ گئی اور اُس کی آنکھوں سے توحش دور ہو گیا۔ "تم بہت اچھے ہو۔ تم نے ہمیشہ میرا کہنا مانا اور مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی تمام عمر میری مرضی پر چلو گے — بس اب مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ چلو کھانا کھائیں۔"

۴

وہ سوچنے لگا۔ اور سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہونچا کہ طاؤس ہی وہ شخص ہے جس نے اُس کی ماں کے ساتھ دغا کی۔ کیونکہ وہی مشہور اور دولتمند وکیل ہے۔ — مشہور اور دولتمند۔ لیکن لاولد! اور اس کے مقابلے میں یہ دونوں کیسی بے بسی کی زندگی گذار رہے ہیں؟۔ اُس کے جسم میں تنفر اور حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی مگر اس نے ضبط کیا۔ ماں سے جو وعدہ کر چکا ہے اُسے وہ نہیں توڑ سکتا۔ اماجی نے اُسے انتقام لینے کی ایک اور راہ دکھادی ہے۔ وہی بہتر ہوگی۔ اور اُسی پر اُسے عمل کرنا چاہیے۔

شیراز نہایت ذہین و طباع ہے اور اب تو اُسے کچھ کرکے دکھانا ہے۔ اس کی تمام تر توجہات تعلیم پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ گلی کے لڑکے اُسے چھیڑتے ہیں۔ بازار والے اُس کی ماں کو دیوانی کہتے ہیں۔ مگر وہ بُرا نہیں مانتا، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ جب ہی تو وہ آج امتحان میں اول آیا۔ اُسے دو انعام بھی ملے ہیں۔ ایک اسکول کی طرف سے بڑا تمغہ، دوسرا طالوت وکیل کی طرف سے پچاس روپے کی تھیلی۔ وہ خوش خوش گھر آ رہا ہے۔ مگر اُسکے دل میں مسرت و استعجاب کے ملے جلے جذبات ہیں۔ طالوت نے اُسے یہ انعام کیوں دیا ہے؟ بیشک وہ شہر کا بڑا رئیس اور تعلیمی اداروں کا سرپرست ہے، مگر اس سے پہلے تو اُس نے کسی کو اتنا بڑا انعام نہیں دیا؟۔

آج انعام ملے دوسرا روز ہے۔ شیراز اسکول سے رخصت ہو رہا ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے اسکے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھکر کل کا سارا واقعہ سُنا دیا کہ اُس کی ماں شام کو بازاروں میں پھرتی رہی۔ راہگیروں کو ٹھہراتی اور اُن سے کہتی تھی کہ میرے بیٹے نے انعام حاصل کیا ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ لایق ہے۔ طالوت کو ڈوب مرنا چاہیئے۔ وہ خود تو آرام سے رہتا ہے مگر اُس کا بیٹا سکھ چین سے محروم ہے۔ اُس نے کہا، میں تمہارے فائدے کے لئے ہی کہتا ہوں جس طرح ہو سکے اپنی ماں سے علیحدہ ہو جاؤ ورنہ وہ میڈیکل کالج میں بھی تمہیں بدنام کریں گی۔

شیراز نے غصہ سے جواب دیا" وہ میری ماں ہیں، میں اُن کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا"

پھر وہ بھاگا ہوا گھر آیا۔ امامی مسالہ پیس رہی تھی۔ شیراز نے چیخ کر بولا" اماں! کل تم سارے میں کہتی پھریں کہ میرا باپ میری طرف سے غافل ہے؟"

اُس نے اس کے غصہ کی پروا نہیں کی۔ اطمینان سے اُٹھ کر اُس کے پاس آ گئی اور کہا" ہاں میں نے لوگوں کو بتا دیا ہے کہ تمہارا باپ تمہارے ساتھ مناسب سلوک نہیں کرتا۔ شہر کا سب سے زیادہ مالدار شخص ——— طالوت ——— تمہارا باپ ہے

اور سب لوگوں کو اس کا یقین آگیا ہے "

" نہیں۔ کسی کو یقین نہیں آیا۔ وہ تمہیں پگلی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے صرف تم سے ڈر کر تمہاری بات مان لی ہے "

" مجھ سے ڈر کر ؟ " وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میں ہیبت جھلکنے لگی۔

" نہیں مجھ سے سوائے طالوت کے کسی کو نہیں ڈرنا چاہئے ـــــ " اس کی پتلیاں ٹھہر گئیں اور کسی مخفی جذبے نے اس پر قبضہ کر لیا۔ آج اس کا نفس تحت الشعور بالائے شعور آرہا تھا اور عرصۂ دراز کی کوئی بھولی ہوئی صورت اس کے سامنے تھی۔ شیراز کو یقین ہو گیا کہ اس کی ماں دیوانی ہے۔ اس کے ہوش و حواس ٹھیک نہیں رہے۔ وہ بڑبڑائی " ایاز اب مجھے کبھی نہیں دیکھ سکے گا "

" اماں ! " شیراز نے اس کی حالت سے خائف ہو کر زور سے آواز دی

اماں جی نے کوئی توجہ نہیں کی، گویا وہ وہاں ہے ہی نہیں۔ اور دروازے کے پاس جا کر کہنے لگی " میرے پاس نہ آؤ۔ تم راتوں کو میرے پاس آتے تھے مجھے تم پر اعتماد تھا۔ مگر تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ جاؤ مجھے تم سے محبت نہیں رہی "

وہ اس سے لپٹ گیا۔ اور جھنجوڑ کر اسے ہوشیار کرنے لگا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کپکپاتی ہوئی آواز میں چیخی " ایاز ! "

اس کی وحشیانہ چیخ سے شیراز لرز گیا۔ اماں جی اسے گھورتی رہی اور بولی " ایاز ! میں تمہاری شکل سے بیزار ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں طالوت سے شادی کرنیوالی ہوں ـــــ وہ شریف آدمی ہے، تم بدذات ہو "

پھر اسے دورہ اٹھ آیا اور وہ بری طرح چیخنے لگی۔

" اماں !...... اماں ! میں تمہارا بیٹا ہوں ـــــ شیراز ! " لیکن اس کی کوشش رائیگاں گئی۔

"تم نہیں جاؤ گے؟" اُس پر وحشت وہیبت چھا گئی "تم نے میری زندگی تباہ کر دی، اور اب پھر یہاں آئے ہو؟ - آہ تم نے اپنے بدنصیب بچے کا تو خیال کیا ہوتا...... میں تمہیں مار ڈالوں گی"

"میں ایاز نہیں ہوں ماں...... میں تمہارا بیٹا ہوں" وہ اُسے بتاتا رہا "کیا تم نہیں پہچانتیں؟ میں شیراز ہوں، یہاں اور کوئی نہیں ہے"

مگر وہ ایک روحِ درماندہ کی طرح مضطرب و بے چین ادھر سے اُدھر بھٹکتی رہی - اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے "تم مجھے اب کبھی ہاتھ نہ لگا سکو گے. تم نے میری روح جہنّم واصل کر دی ہے - کس قدر گنہگار، کتنی گمراہ!" اُس نے سِل کے پاس سے پنسیری اُٹھالی "اب تم کسی لڑکی پر بُری نظر نہ ڈال سکو گے" اور پیشتر اس سے کہ شیراز دروازے سے نکل کر بھاگ جاتا اس کے سر پر پنسیری ٹکرائی - خون کی تُلتی بہ نکلی اور وہ بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

۵

آخر اُسے ہوش آیا، اس کے سر میں اب بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا - اور چاروں طرف پٹیاں بندھی ہوئی تھیں - بڑی مشکل سے اُس نے پہچانا کہ اس کے سامنے جو دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اُن میں سے ایک اُس کے پڑوسی شیخ شہناز ہیں - اُس نے گھبرا کر کہا "میری ماں کہاں ہیں؟ انہوں نے مجھ پر قصداً حملہ نہیں کیا"

شیخ شہناز دلاسہ دیتے ہوئے بولے "وہ اچھی طرح سے ہیں ہلکان نہ ہو"

"لیکن وہ ہیں کہاں؟" اُس نے غمگیں آواز میں پوچھا۔

"تمہاری ماں بڑے آرام سے ہیں - اب انہیں کوئی دکھ نہ پہونچے گا" شیخ شہناز نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

شیراز سمجھ گیا کہ اُس کی ماں مر چکی ہے - اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

شیخ نے کہنا شروع کیا "تمہاری دلدوز چیخ سنکر ہم لوگ اندر گھس آئے اور جبتک ہم نے تم کو سنبھالا تمہاری ماں باہر نکل گئیں۔ میں اُن کے پیچھے لپکا مگر وہ کنوئیں میں چھلانگ مار چکی تھیں۔ دن ڈھلے اُن کی نعش برآمد ہوئی اور اب وہ نہایت آرام کی نیند سو رہی ہیں اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ انہیں یہاں سکون میسر نہیں تھا۔ خدا اُن کی مغفرت کرے ـــــ"

شیراز نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا کہ شیخ شہناز کے پاس سرنگوں بیٹھا ہوا شخص وہی وکیل ہے، مشہور، لاولد، طالوت! اس کے پچھلے زخم ہرے ہوگئے، وہ چیخ کر بولا "یہی میری ماں کی موت کا سبب ہے اسے میری نظروں سے دور کردو" طالوت کا چہرہ سفید پڑگیا اور وہ فوراً ایک طرف ہٹ گئے ـ شیراز پر پھر غشی طاری ہوگئی۔

دوسرے روز شہناز نے اُسے ایک راز سے آگاہ کیا۔ "بیٹا تم ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ چار روز تک تم ہزیان میں بہت سی باتیں کہتے رہے اور میں ایک ایک بات پر غور کرتا رہا۔ اس واقعہ کے دوسرے روز میں وکیل صاحب سے ملا۔ اُنہوں نے بھی مجھے بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ غور سے سُنو۔ تم یہ غلط سمجھ رہے ہو کہ وکیل صاحب تمہارے باپ ہیں۔ اُنہوں نے قسم کھا کر مجھے بتایا کہ تمہاری ماں اُن سے محبت کرتی تھیں۔ مگر انہیں تمہاری ماں سے کبھی اس قسم کی محبت نہیں ہوئی۔ ایک روز مرحومہ نے اُن سے کہا "میں ماں بننے والی ہوں مجھے بدنامی سے بچاؤ" یہ انکے بس میں نہ تھا اور جب انہوں نے انکار کیا تو تمہاری ماں کی حالت یکسر بدل گئی تم اُن کے بھانجے ہو اور خود اُن کی کوئی اولاد نہیں۔ اسی لئے اُنہیں ہمیشہ تم سے محبت اور ہمدردی رہی۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرسکتے تھے کہ مبادا لوگ تمہاری ماں کے الزام کو سچ سمجھ لیں۔ اُن کا ایک شخص پر شبہ تھا جو ہر ماہ تمہاری ماں کے پاس بیس روپے

بھیجتا ہے۔ مگر اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ تم نے پرسوں شب بُحران میں اپنی ماں کی آخری دیوانگی کا قصہ سُنایا تو ایاز کا بھی ایک آدھ دفعہ نام لیا۔ ممکن ہے وہی تمہارا باپ ہو لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون اور کہاں ہے۔"

شیراز کو سارا واقعہ یاد آگیا۔ امامی نے اپنے تعلق کا خود ہی ذکر کردیا تھا۔ اور دراصل اُس نے اُسی کو مارا تھا جسے اُس نے شیراز کے روپ میں بحالتِ جنون دیکھا۔

اُس نے ایک سوال کیا۔" تو کیا یہ روپے کوئی اور بھیجتا ہے ؟"

"ہاں!" شیخ شہناز نے جواب دیا۔

اتنے میں طالوت آکر اُس کے قریب بیٹھ گئے۔ شیراز نے اُن کو رحم آلود نگاہوں سے دیکھا۔

طالوت بیچارگی کی آواز میں کہنے لگا۔" یقین کرو شیراز! تم میرے بیٹے نہیں ہوا لیکن کاش میں تم جیسے خوبصورت و تنومند بیٹے کا باپ ہوتا! تمہاری سعادتمندی اور ذہانت کا مجھ پر بڑا اثر ہے۔ تم میرے بھانجے ہو بیٹے کے برابر۔ میرا گھر تمہارا ہے تم اب وہیں رہا کرنا۔"

اُس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور اُس نے التجا کے انداز میں کہا۔" تمہیں مجھپر اعتبار ہے؟ میرے ساتھ رہو گے نا؟"

شیراز کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلکنے لگے۔ وہ اُس سے ناحق نفرت کرتا رہا وہ کتنا مخلص ہے! کتنا شفیق!!

طالوت پھر بولا۔" میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارا باپ تمہیں بھولا نہیں اور تم جیسے لایق بیٹے کو کوئی بھلائے بھی تو نہیں بھول سکتا۔ تم جلد اچھے ہو جاؤ تو پھر ہم دونوں اس کا کھوج نکالنے کی کوشش کریں گے۔

شیراز نے اپنے غمناک چہرے کو اثبات میں جنبش دی اور طالوت نے ایکبارگی

اُس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے۔

(۶)

لیکن نہیں۔ بمبئی جیسی بڑی جگہ جس کا ایک ایک علاقہ ایک ایک شہر پر بھاری ہے کسی کا پتہ محض نام سے کس طرح چل سکتا ہے؟ - طالوت نے لاکھ کوشش کی مگر ناکام واپس ہوا۔

غالباً ایاز کو اماّمی کے انتقال کی خبر مل گئی ہے، اسی لیۓ ابکے پچاس روپے آئے ہیں اور اماّمی کی بجائے شیراز کے نام اور ساتھ میں ایک مختصر سا خط۔ جس میں مرحومہ کی قبر پختہ بنوانے اور اس پر یہ کتبہ نصب کروانے کی التجا ہے:۔

ہوالغفار

یہ بدنصیب اماّمی کی قبر ہے جس نے تمام عمر مصیبتیں جھیلیں

آخر ۱/- اِسفندار کو اس کی روح منزہ ہو کر اپنے رب

سے جا ملی!۔

خدارا اس کی بخشش کے لیۓ دعا کیجیے ----------!

شیراز نے باوجود طالوت کی محبت اور خلوص کے اس کا احسان اُٹھانا گوارا نہیں کیا وہ اپنے چھوٹے ہی سے گھر میں رہتا ہے۔ مگر کئی کئی گھنٹے اس کو پریشانی میں گذر جاتے ہیں ماں کی نصیحت ہر وقت اُس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ لیکن کالج کے اخراجات پورا کرنے کے لیۓ اُس کے پاس روپیہ کہاں؟ پھر بھی اس کے دل میں بے چینی ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد ایک لائق اور بڑا آدمی بن جائے۔

آخر ایک دن اُس کے پاس ایک بہت بڑی رقم کا منی آرڈر آیا اور ایک خط بھی۔ جس میں صرف یہ لکھا تھا:۔

مجھے تمہارا ارادہ معلوم ہوا۔ تم شوق سے میڈیکل کالج میں

داخل ہوجاؤ- خدا تمہاری آرزوئیں پوری کرے- میرے......"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قلم آگے کچھ لکھتے لکھتے رک گیا ہے- لیکن شیراز سمجھتا ہے کہ کاتب کیا لکھنا چاہتا تھا- اور وہ کیوں نہیں لکھ سکا-

لاہور اس کے لئے نئی جگہ ہے جہاں اس سے کوئی واقف نہیں، یہیں اس نے پہلے پہل خوشی محسوس کی ہے کیونکہ وہ دھبہ جس نے وطن میں اس کی زندگی داغدار بنادی تھی یہاں دور ہوگیا ہے- چند سال ہوتا ہی کتنا زمانہ ہے؟ یہ وقت بھی آنکھ جھپکتے گزر گیا اور اُس نے باقاعدہ ڈاکٹری شروع کردی- خوش خلق، ہنس مکھ، طبّاع، تشخیص میں ہوشیار، اور معالجہ میں کامیاب —— ان خوبیوں نے اُس کا شہرہ دُور دُور پہونچا دیا ہے- پھر اس کے پاس دھن کیوں نہ برسے؟ ایک روز اسے ایک مکتوب ملا-

خدا تم پر برکتیں نازل کرے- مرے بچّے!...... نہیں نہیں میں تم جیسے اچھّے بچّے کا باپ کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوں- آہ! تم میرے ہو لیکن میں تمہیں اپنا نہیں کہہ سکتا......

اُس نے اِن حسرتناک الفاظ سے لکھنے والے کے ذہنی کرب اور رُوحانی اذیت کا اندازہ لگا لیا اور اسے زبردست صدمہ پہونچا- گویا اُس کا باپ اس کے سامنے کھڑا ہاتھ جوڑ رہا ہے-

آج اُس کے دل سے نفرت بالکل مٹ گئی ہے- بلکہ وہ اپنے باپ کو قابلِ رحم سمجھتا ہے- جانے بیچارہ کہاں اور کس حالت میں ہے؟ اُس کے دل میں ایک خلش سی ہے کہ وہ اپنے باپ کی —— جس نے اس کو اس قابل بنایا کہ بڑے سے بڑا آدمی اُسکے آگے سر جُھکاتا ہے —— کوئی خدمت نہیں کرسکتا-

(۷)

کون کہہ سکتا ہے اسکے باپ پر کیا کچھ نہیں بیت گیا- شیراز اُس کے گوشت پوست

کا مگر لڑکا ہے۔ اُس کی رگوں میں اُسی کا خون دوڑتا ہے اور شکل و شباہت بھی بہت کچھ اُس سے ملتی جلتی ہے۔ عین مین دوسرا آیاز معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُس سے کتنا ارفع! کردار میں کتنا بلند!! اس کی ہستی اُس کے لئے مستقل ندامت ہے جس کا خیال اُسے ہر دم ملامت کرتا ہے۔ پھر بھی وہ اس کا بیٹا ہے، بس دوسرا آیاز۔ بڑھاپے میں اُس کا سہارا مگر وہ اُس سے گم ہو گیا ہے۔ اور اُسے حاصل کرنے کی اُس میں جرأت نہیں ہے۔ لوگ شیراز کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ لیکن اس نے اس کا ماضی کس قدر تاریک ——— اور ہولناک بنا دیا ہے؟ پر اب اس کی تلافی بھی تو ممکن نہیں۔ وہ بستر مرگ پر مریض اور فقیر پڑا ہے اُس کے پاس کوئی نہیں، اس کا بچّہ بھی نہیں، جو اب جوان ہے، ڈاکٹر ہے، دولتمند ہے۔ مگر وہ اس سے مدد کی توقع کیسے کر سکتا ہے؟ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا "میں نے اپنا پیٹ کاٹا، آپ بھوکا رہا اور ایک ایک پیسہ جوڑ کر تمہیں بھیجا۔ میں نے تمہیں پروان چڑھایا ہے تم مجھے دم واپسیں، ایک دفعہ۔ صرف ایک دفعہ اپنی صورت دکھا جاؤ" نہیں، وہ اس کی صورت کے شفاف آئینے میں اپنا کریہہ اور ناپاک عکس کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔

شیراز کا انتقام کس قدر زبردست ہے؟ اُس نے معابد بنوا دیئے ہیں جہاں سجدے ہوتے ہیں، گھنٹیاں بجتی ہیں اور پوجا کی جاتی ہے۔ غریبوں کا علاج وہ مفت کرتا ہے۔ مگر امیروں کو اُس کا مشورہ لینے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اُس نے انتقام لے لیا ہے، مذہب سے، ملک سے، سماج سے، لیکن سب سے بڑا انتقام وہ ہے جو وہ لینے والا ہے۔ آج بڑے سے بڑا آدمی اُسے اپنی بیٹی دینے کا خواہشمند ہے۔ اور وہ ——— خود، حرام زادہ ——— شادی کر کے اپنی ذریات میں اضافہ کئے جائے گا۔

——— مگر نہیں، اُس کی روح افسُردہ ہے وہ شعلوں کی لپک میں بھی تاریکیاں منڈلاتے دیکھتا ہے، اُسے معلوم ہے کہ ناجائز اولاد کو کس قدر شرمندگی،

کتنی کوفت اور کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بچے اس کے بعد آوارہ روحوں کی طرح ہر در سے دھتکارے جائیں اور لوگ انگلیاں اٹھا کر کہیں "ان کے خاندان میں فی ہے۔ ان کا باپ حرامی تھا"

سنہ ۱۹۳۹ء

دیدۂ تر

سلیمہ اپنے ایام عروس میں قابل رشک لڑکی تھی۔ خوبصورت، چنچل، ہنس مکھ، تعلیم یافتہ۔ بھلا اس سے زیادہ کوئی شوہر اور کیا چاہ سکتا ہے؟ لیکن اس کی خوشی کی گھڑیاں مختصر تھیں۔ ساس کے بعد سسرال والے اس کی قدر نہیں کر سکے۔ کچھ اس لئے کہ نند بھاوجوں نے اُس سے غلط توقعات قائم کیں اور کچھ اسلئے کہ عمر خاں افزائش نسل کے شوقین اور لڑکے کے متمنی تھے۔ دس سال تک وہ اس سعادت سے محروم رہے۔ اس عرصے میں جوں جوں وقت گزرتا رہا اُن کے حسن سلوک میں کمی اور برہمی مزاج میں اضافہ ہوتا رہا۔ پہلے اُن میں خلق اور انسانیت تھی۔ لیکن انقطاع نسل کا خوف اُن کو بلندی سے پستی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ چاندنی راتیں جب پائیں باغ میں مرمریں حوض کے کنارے سلیمہ اور عمر پہلو بہ پہلو رنگ برنگ کی مچھلیوں کو محو اختلاط دیکھتے، وہ کیف بار گھڑیاں جب دونوں دنیوی جھنجھٹوں کو بھول کر ایک دوسرے کی پرستش کرتے، اب

عہد گزشتہ میں دفن ہو کر رہ گئی تھیں - آدم و حوا جنت سے نکالے جا چکے تھے - شباب کا کنول مرجھا چکا تھا - اور تطویل زمانہ نے ان کی مسرتوں پر اوس ڈال دی تھی -

آخر دریائے کرم جوش میں آیا اور وہ جو سب کا نگہبان ہے، اُسنے سلیمہ کی مسلسل گریہ وزاری سُن لی - اسکے عنقریب ماں بننے کے آثار ظاہر ہونے لگے - ایک آزاد روح قفس عنصری میں قید کر دی گئی اور سلیمہ کی ناامیدی پر اُمید نے ملمع کر دیا - عمر خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا -

حقیقتاً اس کی سرشت میں شرافت تھی، اسلئے باوجود اس کے کہ گھر والے نکاح ثانی کے لئے شدّ ومد کے ساتھ اصرار کر رہے تھے، وہ دوسری شادی پر آمادہ نہ ہوئے اگرچہ وہ خود اولاد کی طرف سے مایوس تھے - اور سلیمہ ان کی نظروں سے گر چکی تھی - پھر بھی زندگی کی کٹھن راہ میں اُن کے پیر نہ ڈگمگائے - اور نجابت و بلند خیالی کا دامن اُن کے ہاتھ سے نہ چھوٹا - اور اب تو دعاؤں کو قبول کرنے والا ان پر مہربان ہو گیا تھا - اس لئے وہی خونخوار عمر خاں جنکی سرخ سرخ خشمناک آنکھیں سلیمہ کا دل دہلائے دیتی تھیں، پھر اپنی رفیق حیات کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگے - اب اُسے دونوں وقت ملتے آٹھ آٹھ آنسو بہانے، آدھی آدھی رات کو خدائے عزوجل کی بارگاہ میں گڑگڑانے اور شوہر کے غصّے سے کانپ اُٹھنے کی ضرورت نہ تھی - مسرت و انبساط نے پھر اس کو ایکبار اپنی آغوش میں لے لیا - اور وہ لب و رخسار جن پر ہر دم بے کسی چھائی رہتی تھی اب ان میں پھر تازگی و شادابی کی لہریں آنے لگیں -

رات کی تنہائی میں، نیند سے کچھ دیر پہلے، وہ دونوں چپکے چپکے سرگوشیاں کر رہے تھے - فضائے بسیط پر خاموشی مسلط تھی - گاہے گاہے شاہ بلوط پر بیٹھا ہوا بلبل ہزار داستاں اپنی نواسنجی سے دل میں چٹکی سی لے لیتا تھا - سلیمہ نیم وا آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگی - اس کے خیالات بھٹکے ہوئے تھے - کبھی وہ کچھ سوچنے لگتی کبھی

خالی الذہن ہو جاتی، اور کچھ دیر ٹھہر کر پھر سوچنے لگتی۔ عمر اور آگے بڑھ آیا اور اس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر کے کہنے لگا...... "سنو! ایک دفعہ میں نے خدا سے دعا مانگی "پروردگار! مجھے صاحبِ اولاد بنا" اُس نے میری دعا قبول کر لی۔ خدا کتنا رحیم ہے! .... اور جب تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہو گا تو اس وقت میری خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟"
سلیمہ کسی مخفی خوف سے لرز گئی اور اُس پر ایسا ہراس طاری ہوا کہ وہ پیدائش کا نام سنکر شرما بھی نہ سکی۔ اُس نے محسوس کیا کہ کوئی دھیمی بہت دھیمی آواز میں اُس سے ڈر ڈر کر کہہ رہا ہے —— کہہ رہا ہے کہ "شاید ایسا نہ ہو"

(۲)

عمر خاں کو انتظار کی گھڑیاں بڑی کٹھن معلوم ہو رہی تھیں۔ کبھی وہ اُٹھ کر برآمدے میں ٹہلنے لگتے۔ مگر ان کا کوئی پھیرا مکمل نہ ہوتا۔ کبھی وہ ایکا ایکی پتھر کی سرد چوکی پر بیٹھ جاتے مگر اضطراب انہیں سکون نہ لینے دیتا۔ کبھی کنکر کی روش پر پھاٹک تک چلے جاتے اور پھر سُرخ سنگریزوں کو ٹھوکریں مارتے چلے آتے۔ انکا دماغ خیالات کے بے پناہ ہجوم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کوئی دم میں شور مچنے والا ہے کہ خدا نے مجھے بیٹا دیا وہ میری زندگی کا سہارا ہو گا اور میں اس کی پرورش میں اپنا تن، من، دھن، سب کچھ لٹا دوں گا۔ جب اس کی ماں کی گود ہری بھری ہو جائیگی تو پھر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا۔ آہ! میں نے بچاری پر کیسی کیسی زیادتیاں کی ہیں۔ اب اس کے آنسوؤں کا پونچھنے والا آتا ہی ہو گا۔ پھر کوئی اس پر ظلم نہ توڑ سکے گا۔ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو وہ جوان ہو گا۔ پھر ہم اُس کی شادی کر دیں گے اور میرا نام کئی پُشتیں گذرنے پر بھی زندہ رہے گا۔

عمر خاں سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھا کر دروازے کے پاس آئے۔ اندر سے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "اے

میرے رب! تونے مجھے اس دار المحن میں کیوں بھیجا ہے؟ دنیا مجھے راس نہ آئیگی" لیکن کوئی اس کی بات نہ سمجھ سکا عمر خاں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہونے لگے۔ مدتوں بعد زندگی کے افق سے اُمید واریاں کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ مگر ان کو اس بات سے بڑی کوفت ہوئی کہ اندر سے میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ کسی نے آکر مبارکباد نہیں دی۔ کوئی مسرت سے پاگل نہیں ہوا۔ اتنے میں دروازہ آہستہ سے کھلا اور بڑی بھاوج منہ بنائے ناک سُنکیڑے باہر نکلیں۔ عمر خاں کو اس طرح بیتاب دیکھ کر انہیں بہت ناگوار گذرا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہیں "تم یہاں کیوں آئے؟" اور پھر دوسری طرف رخ پھیر کر کہتی ہوئی چلی گئیں "لڑکی ہوئی ہے"

عمر خاں کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مارا ہو۔ اُن کے سب کس بل نکل گئے۔ ان کا تنا ہوا سینہ اور کھنچی ہوئی کمر ڈھیلی پڑ گئی۔ چہرے کی سطح پر خوشی کے نقوش فکر و تردد کی سلوٹوں میں بھولے ہوئے خواب کی طرح معدوم ہوگئے۔ کھلی ہوئی باچھیں سکڑ آئیں اور وہ آہستہ آہستہ چپ چاپ، الٹے قدم باہر لوٹ گئے۔

ان کی رفتار میں اب بے چینی اور تیزی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اُن کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال رہا ہے۔ دور سے سُن سُن کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور وہ ان گنت قسم کے خیالات میں کھوئے ہوئے چلے جارہے تھے۔ کبھی وہ اپنے دل کو حلق میں دھڑکتا ہوا محسوس کرتے، کبھی اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ دل بیٹھا جارہا ہے۔ پھاٹک کے آگے لانبے لانبے درخت اُجاڑ پڑے تھے۔ اور خاموش سڑک پر ہیبتناک فضا منڈلا رہی تھی۔ وہ کیکر کے نیچے سرنگوں ہو کر بیٹھ گئے اور استغراق نے انہیں دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔

انہیں سلیمہ اور بچی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ غم و اندوہ میں گھرے ہوئے وہ اپنی ہستی کو بھول گئے تھے۔ سرکش و بے ادب انسان اپنے پیدا کرنے والے سے جھگڑ رہا تھا۔

اُس پاگل کی طرح جو اپنے آپ سے بے ربط و لایعنی گفتگو کئے چلا جاتا ہے - وہ دانت پیس پیس کر کہہ رہے تھے ...... " تو مجھ سے مذاق کر رہا ہے؟ کیا تیرے تمسخر کے لئے میں ہی رہ گیا تھا؟ دس سال تک میں نے تیری عبادت کی - راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تجھ سے دعا مانگی - ایک چیز کی - صرف ایک چیز کی کہ تو مجھے بیٹا دیدے - تو نے مجھ سے میرے ماں باپ چھین لئے - اور میں نے یہ کہکر صبر کیا کہ تو مالک ہے ! - پھر بھی تو نے مجھپر رحم نہیں کیا؟ - بجائے بیٹا دینے کے تو نے مجھپر یہ مصیبت نازل کی ! پھر بھی تو کہتا ہے کہ ہم انسان کو نعمتیں دیتے ہیں ! اگر یہی نعمت ہے تو اپنی نعمت واپس لے لے - مجھے اب تیری بھی ضرورت نہیں " عمر خاں کا دل غصہ سے لبریز ہو گیا اور وہ غلط سلط تاویلیں کرتے ہوئے سلیمہ پر برس پڑے " وہ تو بانجھ ہے ! میں نے اتنی دوائیں کھلائیں تب جاکر وہ ماں بنی - لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ لڑکا پیدا ہی کرنے کے ناقابل ہے "

عمر خاں سلیمہ کی طرف سے یکسر متنفر ہو گئے - اُن کی گزشتہ بے رخی اور سنگدلی پھر سے عود کر آئی - بات بات پر بگڑنا اور قدم قدم پر برہم ہونا ان کا ہر روز کا وطیرہ ہو گیا - تحکمانہ لہجے میں ڈھلے ہوئے سخت الفاظ نے میٹھے بولوں کی جگہ لے لی - اور گھر والے عمر خاں کی اس بیزاری سے اطمینان محسوس کرنے لگے - سلیمہ لبوں پر مہر خاموشی لگائے ڈیڑھ دو سال تک سب کچھ برداشت کرتی رہی - اسکے دل میں بارہا باغیانہ خیالات پیدا ہوئے، جنہوں نے اسے اپنی تذلیل کا انتقام لینے کے لئے اُبھارا - لیکن وہ ہمیشہ یہ سوچ کر " ہم اپنے بزرگوں پر آنچ نہ آنے دینگے " ہتھیار ڈالدیتی تھی -

ایک روز دن ڈھلے اُس نے باپ کی تشویشناک علالت کا حال سُنا - عمر خاں سیر کو گئے ہوئے تھے - وہ کوٹھے پر سے نیچے آئی - کہ نند بھاوجوں سے اجازت

لیکر چلی جائے۔ مگر کمرہ بند تھا اور اندر سے آہستہ آہستہ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ بلکہ بدستور باتیں ہوتی رہیں۔ مغرب کے وقت جب اسکے پاس پھر پیغام پہونچا کہ " باپ کوئی دم کا مہمان ہے " تو اُس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ بچی کو لیکر ڈرتی ڈرتی ڈولی میں بیٹھ گئی۔

عمر خاں نے واپسی پر سُنا کہ بیوی میکے چلی گئی ہیں تو غصے میں لال پیلے ہو گئے۔ نند بھاوجوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی سازش کامیاب ہو رہی تھی۔ جب پہلی بار آدمی یہ کہنے آیا تھا کہ سلیمہ کے باپ کی حالت اچھی نہیں ہے تو اس وقت سے وہ کمرے میں سر جوڑ کر باتیں کرنے بیٹھ گئی تھیں۔ ایک بہانہ اُنکے ہاتھ آرہا تھا اسی کے سہارے وہ عمر خاں کو سلیمہ کے خلاف بڑی سے بڑی کارروائی کرنے پر آمادہ کرنا چاہتی تھیں۔ بہن نے تیوری پر بل ڈال کر کہا " ابھی تو گھر میں ان سے بڑے موجود ہیں! ان کو اجازت لیکر یہاں سے جانا چاہیے تھا!"

عمر کے چہرے پر رنگ تبدیل ہو رہے تھے۔ بڑی بھاوج کو اچھا موقع مل گیا، وہ ان کو تسکین دیتی ہوئی بولیں " تم کیوں خواہ مخواہ خون جلاتے ہو؟ وہ جیسا کریں گی ویسا بھگتیں گی "

دوسری بہن نے اور شہ دی " نہ جانے اُنہوں نے کیا دل میں ٹھانی ہے۔ کئی دن سے اُن کے طور اچھے نہیں ہیں "

عمر خاں کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ پھر اوپر کمرے میں جاکر گرجدار آواز میں ملازم کو بلایا اور ایک خط لکھ کر سلیمہ کے بھائی کے پاس بھیجدیا۔

(۳)

پچھلا پہر، ہو کا عالم، سنسان فضا، گھڑیال نے چار بجائے۔ پے درپے آوازوں

سے عمر خاں اٹھ بیٹھے اور آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے۔

"کون ہے؟" انہوں نے نیند کی آواز میں کہا۔

"بھائی صاحب! میں ہوں، خالد" نووارد نے رنج میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ عمر نے روشنی کردی۔ خالد اندر آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں اُداسی چھائی ہوئی تھی اور چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ساحر کے زیر اثر ہے جو اُس کی جان سلب کئے جا رہا ہے۔ عمر خاں نے پہلو بدلتے ہوئے طنزاً کہا "کہو کیسی گذر رہی ہے" خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ایسے بے وقت کیسے آنا ہوا؟" عمر نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"بھائی صاحب! گفتگو ذرا طویل ہے۔ لیکن اب آپ کو سب کچھ سُن لینا پڑے گا" خالد کی آواز کانپ گئی۔ بہنوئی خاموش بیٹھے رہے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا "آپکا خط پڑھکر جی میں تو یہ آئی کہ اپنا یا آپ کا خاتمہ کردوں مگر مجبور تھا کہ اباجان کی موت نے اسکی مہلت نہیں دی"

"ہیں! اباجان کا انتقال ہوگیا؟" عمر خاں حیرت میں بول اُٹھے۔

"جی ہاں! اسی شب اُن کا انتقال ہوگیا۔ آپ دورے پر گئے ہوئے تھے۔ آپنے اِس چھ ماہ میں پلٹ کر خبر تک نہ لی اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ آپ تو اپنی طرف سے تمام تعلقات ختم کرچکے ہیں۔ لیکن —————— ایک تعلق ابھی باقی رہتا ہے"

خالد کے پہلی بار جواب نہ دینے سے عمر خاں کو ٹھانی غصہ آچلا تھا۔ مگر خسر کے انتقال کا سُنکر وہ دھیمے پڑگئے، خالد بولے گیا "میں آپکے اِس فقرہ کا مطلب نہ سمجھ سکا کہ "سلیمہ کو اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اب اپنے ہی گھر رہیں" بھائی صاحب! ہم لوگ غریب ہیں۔ لیکن بے غیرت نہیں۔ کیا آپ سمجھتے

ہیں کہ آپ کا وہ خط پڑھنے کے بعد ہم لوگ آپ کی طرف رُخ کر سکتے تھے؟ ہاں، وہ جو آپ نے لکھا تھا کہ "کوئی شریف آدمی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس کی بیوی بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر چلی جائے" تو یہ سراسر آپ کی غلط فہمی ہے۔ موقع موقع میں فرق ہوتا ہے۔ کیا وہ عورت جس کا باپ بستر مرگ پر پڑا ہو، جو بارہ سال کی بیاہتا ہو اور ایک بچّی کی ماں ہو، اتنا حق بھی نہیں رکھتی کہ اگر گھر میں کوئی کہنے سننے کے لئے نہ ہو تو وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو جا کر آخری دفعہ دیکھ لے۔ اور وہ تو بھابی جان سے پوچھنے نیچے آئی تھیں۔ مگر سب اندر کے کمرہ میں تھے۔ خوب بھائی صاحب! آپنے فیصلہ تو بڑا اچھا کیا۔ ادھر ابا جان نے دم توڑا۔ اُدھر آپ کا خط پہنچا، آپ سمجھ سکتے ہیں اُس وقت ہم پر کیا کچھ بیت گئی ہوگی؟"

عمر خاں کی پیشانی پر عرقِ انفعال چمکنے لگا۔ اور وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ خالد نے شکستہ آواز میں پھر کہا "اُس بیچاری کا میکہ ہی کیا؟ ایک باپ تھا وہ رخصت ہو گیا۔ رہ گئے بھائی بھاوج سو وہ مفلس ہیں۔ آپا کا میکہ تو یہی ہے جہاں آپ نے اُن کے آنے کی ممانعت کر دی۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ انفراغِ تعلیم کے بعد سے میں آجتک بے روزگار ہوں اور ابا جان کے جانے کے بعد تو ہم دلو دو دانو کے محتاج ہو گئے ہیں۔ سلمٰی آپ کے لئے تڑپ تڑپ کر بیمار پڑ گئی۔ اور آج مر کر ہی اُس نے اپنی ماں کا سینہ چھوڑا۔"

عمر خاں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بیٹی کی موت کی خبر اُن کے خرمنِ ہوش و خرد پر بجلی بنکر گری۔ اُن کا طنطنہ خاک میں مل گیا۔ وہ بچی جو اپنی معصوم کلکاریوں سے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتی تھی، اُن کی آنکھوں کے سامنے آگئی وہ اُن کے پاس آنے کے لئے پھڑک رہی ہے اور وہ جھڑک رہے ہیں! وہ کسی چیز کے لئے مچل رہی ہے اور ان کی شکل دیکھ کر اس طرح خاموش ہو گئی گویا مطلوبہ شئے

سے کوئی افضل چیز اُسے مل گئی ہے! ماں نے اسے کوئی چیز کھانے کے لئے دی اور وہ اُسے لیکر جھٹ باپ کو کھلانے دوڑی!۔ آج وہی بچی عمر خاں کے دل کو اپنی یاد سے برما رہی تھی جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی شفقت پدری سے محروم رہی۔

"بھائی صاحب!" خالد نے غمناک ہو کر کہا۔ "میں آپ کے پاس اسلئے نہیں آیا کہ اپنی غریبی کا اظہار کروں بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ للہ میری بہن پر رحم کیجئے۔ مجھ جیسا خوددار آدمی آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہے۔ آپا بیمار ہیں۔ وہ سلمیٰ کی لاش سے لپٹی گھنٹوں روتی رہیں اور مجھ سے کہا "خالد! میری خاطر اُن کے پاس چلے جاؤ۔ اُنہوں نے جو کچھ لکھا وہ ٹھیک ہے۔ بے شک مجھ سے قصور ہوا اور میں اپنے کئے پر پشیماں ہوں۔ خدارا، اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کر میرا قصور اُن سے معاف کرادو۔"

سلیمہ کی دردناک التجا سُنکر عمر خاں کا دل بھر آیا۔ سوچنے لگے "ہائے میں نے یہ کیا کیا؟ میں کتنا سفاک اور بے درد ہوں! یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے۔ میں نے خط میں کیسی سخت باتیں لکھی ہیں!۔ آہ! میری جلد بازی نے یہ دن دکھایا!"

اُن کا ضمیر بھی اُن کو ملامت کرنے لگا "عمر! کیا تم ہادیِ برحق کے احکام بھول گئے؟ کیا خاکِ عرب سے اُٹھنے والا رسولؐ میاں بیوی کے بارے میں یہ نہیں فرماتا:۔

"مسلمانو! تم اپنی بیویوں سے شریفانہ سلوک کرو۔ اور جب کبھی کسی قسم کی ناخوشگواری پیدا ہو تو ٹھنڈے دل سے اس کے اسباب پر غور کر کے جلد سے جلد صلح کر لو۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ نباہ کسی طرح ممکن نہیں تو نیکی اور شرافت کے ساتھ ان کو علیحدہ کردو ——————

اپنے نکاح میں رکھ کر اُن کو اُن کے حقوق سے محروم کر دینا تو بہت ہی بُرا ہے۔"

خالدؔ نے آہستہ آہستہ نگاہ اونچی کی تو دیکھا کہ عمرؔ خاں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے اور اُن کی آنکھوں میں سیلاب اشک اُمڈا چلا آرہا ہے۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ عمرؔ خاں نے اُٹھ کر خالد کو سینے سے لگا لیا۔ اور شکستہ آواز میں کہا "چلو"

سنہ ۱۹۳۹ء

حسن و شباب

ذوالفقار خواب میں اپنی دلی آرزو پوری ہوتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ وہ اور ریاسمین کسی گوشۂ تنہائی میں ہم آغوش ہیں۔ اس خوابناک حقیقت نے اس پر ایسی کیفیت طاری کر دی تھی کہ وہ کسی طرح بھی اس طلسم سے بیدار ہونا نہیں چاہتا تھا مگر یکایک بچے کے رونے اور کراہنے سے وہ چونک پڑا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے زبردستی اُسے فردوس بریں سے نکال کر دنیا کی جھنجھٹوں میں دھکیل دیا بچے کا اس طرح بلک بلک کر رونا اسے سخت ناگوار گذرا اور بڑبڑاتے ہوئے اس نے دائیں طرف غصے سے دیکھا ——— اُس کی بیوی بے خبر سو رہی تھی۔ اور اُسے دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ یہ وہی رضوانہ تھی جس کی کبھی ایک ایک ادا پر وہ دل و جان سے فدا تھا۔ مگر اب اُس کی حسن پرستی اُسے اس سے دُور لئے جا رہی تھی۔ کیونکہ اس کے شاداب چہرے پر چھائیاں پڑ گئی تھیں، گلابی

ہونٹ سفید ہو گئے تھے - جلد مرجھا گئی تھی اور دراز چمکیلے بال بے رونق ہو گئے تھے - لیکن ذوالفقار نے یہ سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ چار سال میں پانچ بچوں کی ماں بننے والی عورت خزاں رسیدہ کلی کی طرح پژمردہ نہ ہو گی تو کیا رہین تمکین و ہوش رہیگی؟ ایک زمانہ تھا کہ اسی رضوانہ کی رعنائیوں اور شباب دستی نے اس کے جذبات میں ہلچل مچا رکھی تھی - اس کا گھونگٹ میں سے جھانکنا، دست حنائی سے پان کھلانا، افشاں چُنی ہوئی جبیں پر بل ڈالنا، اور کسی بات پر شرما کر مسکرا دینا، اُس کے لئے قیامت کا سامان تھا - مگر اب یہ سب باتیں اوراق پارینہ ہو چکی تھیں - اُس کے لئے اس کا وجود اب ایک بے جان مجسمے سے زیادہ نہ تھا - کیونکہ اُس کے ساغر جوانی سے وہ اپنا نفس سیراب کر چکا تھا اور اس کی نگاہیں بساط عیش پر کسی نوبہار ناز کی متلاشی تھیں

بچّے کے رونے کی آواز سُنکر دوسرا بچّہ بھی کلبلایا اور پھر دونوں نے مل کر غل مچانا شروع کیا - ذوالفقار نے جھلا کر بیوی کو جھنجوڑا - لیکن اُسے یہ خیال نہ آسکا کہ رضوانہ بچوں کی بیماری میں گھری اور لگاتار کئی راتیں جاگ چکی ہے - بچاری نے گھبرا کر آنکھیں کھولدیں اور دونوں بچوں کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرنے لگی - مگر ذوالفقار ہنکارے گیا "میرے دم پہ یہ کیا مصیبت ہے!؟ - کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرا پلنگ دوسرے کمرے میں بچھوا دیا کرو، لیکن نہیں - میری تو قسمت ہی پھوٹ چکی ہے - دن بھر کام میں مروں اور رات کو یوں نیند حرام ہو......"

رضوانہ چُپ کی چُپ رہ گئی -

۲

یاسمین کو ذوالفقار نے پہلے پہل اس وقت دیکھا تھا جب وہ چوتھی کھیلنے میں رضوانہ کی مدد کر رہی تھی - چائے سے فارغ ہو کر ذوالفقار کو چلتے وقت معلوم ہوا کہ دستور کے مطابق اُس کی جوتی چھپا دی گئی ہے جو دولھا کی اماں سے نیگ لئے بغیر نہیں ملے گی اور نیگ لینے والی

یہی یاسمین تھی۔ گیارہ سال کی عمر، بوٹا سا قد، چاند سا مکھڑا، ہونٹوں پر مسکراہٹ آنکھ میں شوخی۔ بس اُس وقت اس نے جانا کہ یہ رضوانہ کی چھوٹی بہن ہے۔ ہرچند کہ جوانی کے ہنگاموں نے اُسے رضوانہ کے علاوہ کسی اور طرف مائل نہ ہونے دیا، پھر بھی اُس کے قلب پر یاسمین نے ایک مدھم سا نقش مرتسم کر دیا تھا، جو کبھی کبھی سطحِ احساسات پر اُبھر کر موجِ خرد سے ٹکرا جاتا تھا۔ اور اس پانچ سات سال کے عرصے نے تو دنیا ہی ایک نئی آباد کر دی تھی۔ ایک طرف رضوانہ کا دورِ انحطاط شروع ہو چکا تھا اور بڑھاپے کی علامات دوڑی چلی آ رہی تھیں، دوسری طرف یاسمین کے گداز جسم پر شباب نچھاور ہو رہا تھا۔ مدھ بھری آنکھیں آتشیں رخسار، احمریں لب اور مستانہ چال۔ کیوں نہ ذوالفقار کا صبر و قرار لوٹ لیتی؟۔

پہلے وہ سال میں صرف ایک دو بار، وہ بھی چند دن کے لئے رضوانہ کے میکے آتا۔ مگر جب سے یاسمین کی جوانی اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ بیدار ہوئی تھی وہ کئی کئی بار خاصی لمبی رخصت لیکر رضوانہ کو میکے پہونچانے آتا۔ بیوی باوجود اس کے دکھے پن کی شاکی ہونے کے دل میں کہتی "یہ کتنے اچھے ہیں! میں ذرا بیمار ہوتی ہوں تو فوراً مجھے اماں سے ملانے لے آتے ہیں" لیکن یہ خیال اُسے بھول کر بھی نہ آیا کہ ذوالفقار جسے وہ حد درجہ ہمدرد سمجھتی ہے محض یاسمین کی خاطر اسقدر مہربان ہے۔

خون کی کمی اور اختلاج کے دوروں نے رضوانہ کو بیحد کمزور کر دیا تھا نچلی منزل میں دریچے کے پاس ایک صاف سے پلنگ پر وہ تکئیے کے سہارے لیٹی تھی۔ سامنے کی دیوار پر ایک چھوٹا سا گھنٹہ ٹک ٹک کر رہا تھا۔ اور اس کی ہر دم آگے بڑھنے والی سوئیاں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ اطمینان و مسرت کی گذری ہوئی گھڑیاں پھر کبھی واپس نہیں آتیں۔ اُس نے آنکھیں کھول کر کمزور آواز میں کہا "اماں یاسمین سے کہئے کہ وہ ذرا اُن کا آگا تاگا دے۔ دو ایک دن میں وہ چلے جائیں گے۔ انہیں کسی قسم کی

تکلیف نہ ہو"۔ بوڑھی نانی سب سے چھوٹے بچے" کو تھپکتے ہوئے بولیں" تم اطمینان سے سو جاؤ۔ وہ میاں ذوالفقار ہی کو کھانا کھلانے گئی ہے"۔

اوپر کی منزل میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر ذوالفقار بستر پر لیٹ گیا اور یاسمین دستر خوان اٹھانے لگی۔

اس کا حسن بلّور کی طرح شفّاف تھا۔ اُس نے عشق و محبت کے قصّے صرف پڑھے اور سُنے تھے۔ لیکن خود اس رمز سے ابھی ناواقف تھی۔ ہاں، جن مردوں کو اس نے دیکھا تھا اُن سب میں یہی ذوالفقار اس کے لئے جاذب توجہ تھا۔ کچھ اس لئے کہ وہ وجیہ اور خوبرو تھا اور کچھ اس لئے کہ اسکے ساتھ اس کی خاصی بے تکلّفی سی تھی۔

ذوالفقار اُسے اسوقت کچھ عجیب وغریب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دست و پا کی ذرا سی حرکت سے اُسے مستی و جوانی اور لب و زبان کی خفیف سی جُنبش سے موسیقی و ترنم کی بے پناہ بارش ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے سینۂ شفّاف پر اُبھرے ہوئے آبگینوں میں مۓ شباب چھلکے پڑ رہی ہے۔ اور عارض گلفام اُس کے پرشوق لبوں کو دعوت لمس دے رہے ہیں۔ وہ بے قابو ہو گیا اور اُس کی تمام شیطانی ترغیبیں عقل و آگہی سے برسرِ پیکار ہونے لگیں۔

یاسمین نے اپنا گورا اور نازک ہاتھ جس کو باریک، سیاہ و سُرخ چوڑیاں زیب دے رہی تھیں، آگے بڑھا کر پان دیا" دولھا بھائی آپ پان کھائیں گے؟"

ذوالفقار نے مصنوعی آواز سے کہا" اف، میرا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے۔ سرہانے بیٹھ کر ذرا دبا دو"

یاسمین سرہانے بیٹھ گئی۔ ذوالفقار نے پوچھا" پان کہاں ہے؟"

یاسمین پان لحاف کے اندر اس کے منہ میں دینے لگی تو اس نے اس کی ایک انگلی

دانتوں میں دبا لی۔ پھر اُس کے ہاتھ کو مضبوط پکڑ کر کئی بار چوما۔ یاسمین تڑپ سی اُٹھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کسی ساحر کی معمول ہے۔ خود اُس کی کوئی ہستی نہیں۔

ذوالفقار اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اُسے اپنے پاس سرکا کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں

"یاسمین! ......" اُس نے شکستہ آواز میں کہا "مجھے تم سے محبت ہے ..... کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟"

یاسمین گم سم ہو گئی۔ اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ اس کے جذبات میں طوفان بپا ہو گیا تھا۔ ایک ایسا طوفان جس کو سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک جوان مرد کی آغوش جذبات کے مچلتے وقت کسقدر خطرناک ہوتی ہے! .... آسمان پر ایک تارہ ٹوٹا اور اپنے پیچھے دور تک چنگاریاں برساتا ہوا تاریکی کی وسعت میں گم ہو گیا۔

رات کی سیاہ کاریاں ختم ہو گئیں۔ فلک نیلگوں کے مشرقی گوشہ میں سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا اور صبح کی اولیں جھلملیوں نے دیکھا کہ یاسمین اپنے کمرے میں سر بسجود ہے۔

اُس کے آنسوؤں سے جا نماز کا بالائی حصہ تر ہو چکا تھا۔ اور اسکی سسکیاں عرش کے رہنے والے سے توبہ و فریاد کر رہی تھیں۔ بہت دیر خدائے عزّوجل کے حضور میں گڑگڑانے کے بعد اس نے دوزانو ہو کر اپنے ہاتھ اوپر اُٹھائے:۔

اے عالم ظاہر و باطن!
میری عقل و فراست کا سینہ،
ندامت و اندوہ کے داغ داغ ہے۔
گناہ کا احساس میرے قلب و دماغ کو
ملامت کے تیروں سے چھلنی کر رہا ہے۔

میری روح جو کل تک پاکیزہ تھی
آج گھناؤنی ہو گئی ہے
اے توّاب وغفّار!
میں اپنے گناہ کی بخشش چاہتی ہوں۔
اگرچہ میں تجھ سے اب کچھ مانگنے کے قابل نہیں رہی،
پھر بھی التجا کرتی ہوں کہ تو مجھ پر رحم فرما۔
اے ستّار العیوب!
مجھے اپنے دامن رحمت میں چھپا لے۔
یہ احساس ——— کہ میں نے ایک ایسا گناہ کیا ہے۔ جس کا کفارہ
ادا کرنا ناممکن ہے
یہ احساس ——— کہ میں نے اپنی بہن پر ایسا ظلم کیا ہے جس کی
تلافی نہیں ہو سکتی۔
مجھے زندگی اجیرن کئے دے رہا ہے۔
اے مالک حیات وممات!
مجھے قبر کی آغوش میں سلا دے!!

ابھی اُفق پر دو ایک ستارے سنبھالا لے رہے تھے۔ فانی انسان کی مجبوری اور نفس کے آگے بے بس ہو جانے کا شرمناک وغمگین منظر دیکھ کر ان کا دل بیٹھ گیا۔ اور وہ نور کا سفید کفن پہن کر دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو گئے۔
باہر ناریل کے درختوں نے آپس میں کہا "اس بچاری کا تقدس خاک میں مل گیا ہے"
نیلوفر کے پودے سرگوشیاں کرنے لگے "ہائے کیسی ملکوتی روح داغدار ہوئی ہے"
بید مجنوں کی بیلوں نے عشق پیچاں کی کلیوں سے کہا "آہ یہ جوانی گناہ آلود

ہوئے بغیر نہیں رہتی ۔"

شمشاد و صنوبر کے پتّے دھیمی آواز میں سرسرائے "یہ کیا جوانی زندگی کو ناپاک بنانے کے لئے عطا ہوتی ہے؟"

سرو، و چنار سے اس کا جواب نہ بن پڑا اور وہ ایک آہ سرد کھینچکر خاموش ہو رہے

وہ جتنا آنسوؤں کو پونچھتی تھی، سیلاب اشک اُتنی ہی روانی سے اُمڈا چلا آتا تھا - آخر اُس نے گریۂ پیہم کو بہزار دقّت ضبط کر کے لکھنا شروع کیا۔

ہاں میں اب اقرار کئے لیتی ہوں

دل کی باتیں جب تک چھپا سکی، چھپاتی رہی، اب اس ازدواری سے فائدہ تو نہ نکلے گا۔

آپنے میرے دل کے دروازے پر دستک دی اور مجھے بلایا۔

پھر بلایا ——— پھر بلایا ——— یہاں تک کہ آپ مجھے زبردستی اُٹھالے آنے پر آمادہ ہو گئے۔

اور میں ——— اندھی، بہری، اور گونگی بنی بیٹھی رہی!

آپنے مجھے مسحور کیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

آپنے مجھے نغمات سُنائے اور میں نے سماعت کو دام فریب سمجھا۔

آپنے مجھ سے پوچھا "کیا تم مجھے چاہتی ہو" اور میں چپکی رہی۔

——— لیکن حقیقتاً مجھے آپ سے محبت ہے، اس وقت سے جب سے آپنے پہلی بار اس روز مذاق میں مجھے گدگدایا تھا ...... خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھے جو محبت آپ سے تھی اُس میں نفسانیت کو بالکل دخل نہیں تھا میں بس یہ چاہتی تھی کہ آپکے پاس بیٹھی رہوں، آپکی باتیں سنتی رہوں اور

یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ محبت کا انجام یہی ہوتا ہے۔
میں تو سمجھتی تھی کہ محبّت دو روحوں کا اتحاد ہے۔
مگر نہیں —— محبّت تو بھوک ہے، خواہش ہے جو صرف جسمانی
اتصال و لذت سے پوری ہوتی ہے!۔
آہ! میں نے یہ کیا کیا؟ مجھے آپ ہی سے محبت کیوں ہوئی؟ آپ
تو میرے بہنوئی ہیں، میری حقیقی بہن کے شوہر!۔
آہ! میں نے اُن کی امانت میں خیانت کی ہے۔ کتنی بڑی خیانت!
اب میرے لئے صرف ایک راہ کھلی ہے، اور وہ ہے ——
اپنی زندگی کا خاتمہ!
لیکن مجھے مرنا نہیں آتا۔ میں نے اتنی دیر خدا سے دُعا مانگی
لیکن وہ قبول نہ ہوسکی۔
للہ میرے لئے آپ تھوڑے سے زہر کا انتظام کر دیجئے۔
میں آپ کو اپنی محبّت کا، اور اس محبت کا جس کا آپ نے
کل شب اظہار کیا —— واسطہ دیتی ہوں۔
یہ آپ کا مجھپر بڑا احسان ہوگا۔ جسے میں بعد الموت بھی نہ بھولونگی۔

ذوالفقار ہاتھوں میں سر تھامے خاموش بیٹھا تھا۔ رات کی واردات نے اُسکی آتشِ شوق اور بھڑکا دی تھی۔ اسکے پراگندہ خیالات، اس کی سمجھ، اور ایمان کو بھگائے جارہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا "ماں باپ کسقدر غلطی کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ ایسی غلطی جس کی تصحیح پھر ناممکن ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی عمروں میں کافی تفاوت ہونا چاہیے......"
کچھ دیر تک وہ یونہی سرنگوں رہا۔ پھر ہاتھ ملتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ "اگر رضوانہ

.... تو پھر کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ میں یاسمین سے شادی کر لوں گا" یکایک کسی چیز سے اُس کو ٹھوکر لگی اور اس کا سلسلۂ خیال وہیں ٹوٹ گیا۔ چاء ماما لیکر اوپر گئی۔ یاسمین میں اُس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ شرم و انفعال نے اُسے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔ اُس کے نہ آنے سے ذوالفقار کو زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ چاء بنانے کے لئے اُس نے قندوانی کھولی تو اُس میں ایک پرچہ پڑا ہوا دیکھا۔

خط پڑھ کر وہ اپنے سے بیگانہ ہوگیا۔ اس پر دیوانگی سی چھا گئی اور جو کچھ اس کا نفس لکھواتا رہا، اس نے جلدی سے لکھا۔

یاسمین! افشائے راز نہ ہونے پائے!! ہوش میں آؤ! تم کیوں اسقدر ہراساں اور مایوس ہوئی جاتی ہو؟ میری طرف دیکھو، میری آغوش تمہارے لئے وا ہے۔ تم دنیا میں یکہ و تنہا نہیں ہو۔ تم مجھے اپنا سہارا اور محافظ سمجھو —— ایک مضبوط چٹان کی طرح میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ اور دنیا کی کوئی ہستی تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ یاسمین! تم نہیں جانتیں مجھے تم سے کتنی شدید محبت ہے۔ میں تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی کر سکتا ہوں اور .... دیکھو، رضوانہ دائمی بیمار ہے، وہ بچتی نظر نہیں آتی۔ اسکی زندگی عنقریب ختم ہو جائیگی۔ پھر میں تم کو شرعی طور بھی اپنا بنا لوں گا۔ پیاری یاسمین! تم میری نظر میں اب بھی پاک ہو! اور جو کچھ ہم نے کیا، کون ہے جس نے کم از کم اُس کی خواہش یا ارادہ نہ کیا ہو؟ نیّت تو بہرحال ہوئی۔ پھر سب ہی گنہگار ٹھہرے!۔

جانِ تمنا! تم نے مجھ سے ایک ایسی چیز کی خواہش کی ہے جس کا نام ہی لرزہ بر اندام کر رہا ہے۔ خدارا اس قسم کا خیال بھی اپنے دل میں کبھی نہ پیدا

ہونے دینا۔ میں تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم مجھے صرف اتنا لکھ دو کہ تم مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔ رضوانہ اپنی طویل بیماری سے عاجز آ گئی ہے۔ میں اُسے اس دکھ بھری زندگی سے آج ہی آزاد کر دوں گا ــــــ"

(۳)

ذوالفقار کی تحریر نے مائل بہ سکون کرنے کے بجائے ذہن و دماغ کی بنیادیں ہلا دالیں اُس نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی اُس کے دماغ کو موگری سے کوٹ رہا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر مضطربانہ ٹہلنے لگی۔ گھڑی گھڑی کوئی اس سے ٹوٹے ہوئے سانسوں میں کہہ رہا تھا "کیا تم اپنی بہن کی سیج پر آرام سے سو سکو گی؟" اور یکبارگی تخیّل نے اُس کے سامنے ایک سیج بچھا دی جس پر حسین و نازک پھول چنے ہوئے تھے۔ لیکن فوراً ہی یہ تختۂ گل خارہائے مغیلاں اور دہکتے ہوئے انگاروں سے پَٹ گیا۔ دفعتاً کسی نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ پھر لگاتار آوازیں آتی رہیں۔ "یاسمین! ابھی کیا ہو گیا ہے؟ تو نے اندر سے کنڈی کیوں لگائی ہے؟ دیکھ، مجھے کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی"۔

یاسمین نے رضوانہ کی نحیف آواز پہچان لی۔ وہ تڑپ کر اٹھی، بڑھی، رکی، چلی، جھجکی ــــــ آخرش اُس نے کنڈی کھول دی۔ رضوانہ اندر آ گئی۔ اور پلنگ پر ہانپتی ہوئی بیٹھ گئی۔ یاسمین کو بے حال دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔

اُس کی آنکھیں سوجھ گئی تھیں۔ چہرے پر ورم سا آ گیا تھا۔ اور بال دیوانوں کی طرح بے ترتیب پڑے تھے۔ اُس نے کنڈی دوبارہ لگا دی اور دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔

رضوانہ حیرت سے بولی۔ "یہ تجھے آج ہو کیا رہا ہے؟ یہاں آ، بُو!"

یاسمین ایک سنگین مجرم کی طرح آگے بڑھی اور یکلخت اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ بہن کو یوں روتا دیکھ کر رضوانہ کو رونا آگیا، بولی: "یاسمین! کیا ہوا؟"

اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنا سر وہیں رکھے رہی اور اُس کے بار بار پوچھنے پر اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "آپا...... تمہارا قصور کیا ہے۔ بہت بڑا قصور!......"

"ارے!" اس نے فرش پر اترتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں کہا "کیا تو میرا کوئی قصور کر سکتی ہے؟"

"ہاں، آپا!" وہ بے اختیار ہو کر چیخی۔ "کل رات کو میں ——— اور دولہا بھائی......"

رضوانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گویا اب دھڑک کر پھر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جائیگا۔ مگر اُس نے ضبط سے کام لیا اور اس کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "واہ ری پاگل!...... اُٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ اماں جان سمجھ رہی ہیں کہ تمہیں پھر کوئی نئی چیز منگانی ہے، جب ہی یہ سوانگ بھرا ہے۔ وہ بچاری کئی آوازیں دیکر چلی گئیں"

یاسمین نے سر اونچا کیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولی: "تم اپنا دم نہ گھوٹو۔ جو دھواں اُٹھ رہا ہے اُسے نکلنے دو، ورنہ تمہارے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے وہ تمہاری جان پر بنا دیگی مجھے کوسو، مجھے مارو۔ میں تمہاری مجرم ہوں ——— مگر اس قصور کو معاف کر دینا تمہارے بس میں نہیں ہے ——— میں نے تم سے اس لئے کہا کہ میری روح اعترافِ جرم کے لئے مچل رہی تھی۔ تم سے اگر مجھ کو سزا نہیں دی جاتی تو میں خود دوں گی......"

رضوانہ بُت بنی بیٹھی رہی - جیسے کوئی سکتے میں ہو - یاسمین نے اُس کی نظر بچا کر ذوالفقار کا خط اور اُس کا جواب ایک لفافے میں رکھا - وہ کسی نتیجے پر پہونچ گئی تھی اور ذوالفقار کے سامنے جاتے ہوئے اُسے اب کوئی حجاب معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اُوپر جاکر اُس نے ذوالفقار کو جو اُسے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا تھا، معنی خیز نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے محبت کے کتنے فسانے سُنا دیئے - پھر اُس کے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو آہستگی سے نیچے گرا دیا اور وہ لفافہ دیکر جلدی سے چلی آئی - اُس کی دونوں آنکھوں کے کونوں سے آنسوؤں کے دو لمبے قطرے بہ نکلے اور رخسار کے ہیروں میں جذب ہوگئے - نیچے کی منزل میں وہ ایک در کے پیچھے چوروں کی طرح کھڑی ہوگئی - اور حسرت بھری نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی -

اُس کا دل پُکار پُکار کر کہہ رہا تھا "اُس کے پاس جا یہ جو تجھے عالم وجود میں لائی تسکین دے گی" ــــــ مگر اُس میں ایسی مقدس ہستی کو اپنا کریہہ چہرہ دکھانے کی ہمت نہیں تھی - دُور ہی دُور سے، دل ہی دل میں اُس نے بصد عجز و اعتقاد اپنی ماں کو سلام کیا اور جانے کی اجازت مانگی ــــــ اور روتی ہوئی چھپتی چھپاتی گھر سے نکل گئی -

(۴)

ذوالفقار نے بے تابانہ خط پر نظریں دوڑائیں :-

نہیں نہیں - خدائے جبار و قہار کی قسم اور قسم اُس کتاب الٰہی کی جس پر میرا اور میرے ماں باپ کا ایمان ہے، میں یہ نہیں چاہتی کہ...... میں اپنی بہن کی جگہ لوں - ﷲ آپ اس خوفناک اور قابل نفریں ارادے سے باز آیئے - جس نے میرے جسم کے روئیں روئیں کو کرب و بیچینی میں مبتلا

کر دیا ہے - آپ نہیں سمجھ رہے کہ میں نے اپنی بہن پر —— اپنی معصوم و شریف بہن پر —— کسقدر ظلم کیا ہے - اُسے مجھ پر کامل اعتماد تھا - اسلیئے وہ بے تکلف آپکی خدمت کرنے کا موقع دیتی تھی - پر آہ ! میں نے —— نیک کی کی بیٹی ہوکر، شریف باپ کی اولاد ہوکر —— اس اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور محسن کش ناگن کی طرح اُسی کو ڈس لیا - اور جو کچھ میں نے کیا اب اسکی کسیقدر تلافی صرف ایک ہی طرح ہو سکتی ہے —— میں اپنی محبت اُن کے قدموں پر بھینٹ چڑھاتی ہوں اور آپ سے بہ منّت التجا کرتی ہوں کہ میری بہن کو —— جو بدنصیب اب بھی میری طرف سے بدظن نہیں ہوئی —— موت اور روحانی آزار سے محفوظ رکھنے کے لئے تمام امکانی کوششیں کر ڈالئے اور اُن کے ننھے ننھے بچّوں کو سوتیا ڈاہ اور دَر دَر کی بھیک مانگنے سے بچائیے —— مجھے آپکے اس فقرے پر پورا بھروسہ ہے کہ "میں تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی کر سکتا ہوں" —— ہائے کیا اچھا ہوتا کہ میری بہن خود اپنے ہی ہاتھوں سے مجھ کو کوئی قرار واقعی سزا دیدیتی ...... لیکن خیر، وندھیاچل کی گھاٹیوں میں بہنے والی ندی تو اس ناپاک اور ناہنجار زندگی کا خاتمہ کر دینے کے لئے مجھ سے منہ نہ موڑیگی؟!"

۱۹۳۹ء

گلناز

بی۔اے۔ پاس کرکے اپنی سی تمام کوششیں کرلیں، مگر نوکری کہیں نہ ملی، غریب آدمی، ماں نہ باپ لے دیکے ایک رشتہ کی خالہ تھی۔ بس اسی نے پروان چڑھایا یہ اس لالچ میں کر بیٹی کے لئے بر نہ تلاش کرنا پڑے۔ کچھ اثاثہ باپ سے ورثے میں ملا تھا، کچھ تھوڑی بہت جائیداد مرحوم خالو کی تھی اسی سے گذارہ اور تعلیم کا خرچ پورا ہوا۔ اب صرف معمولی سی آمدنی رہ گئی تھی، جب تک وہ کالج میں رہا خالہ نے ضد نہ کی مگر اب وہ کیسے چپ رہ سکتی تھی؟ کہہ سنکر اسے راضی کر ہی لیا اور شادی کردی۔

یہ اگلے وقتوں کے لوگ، اِس زمانے کے نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں کا ہرگز اندازہ نہیں کرسکتے۔ جب تک بچارے تعلیم پاتے ہیں، سینکڑوں اُمیدیں ہزاروں ارمان اور انگنت آرزوئیں اُن کے دلوں میں پرورش پاتی ہیں۔ وہ سوچتے ہیں،

پڑھ لکھ کر ہم یہ بنیں گے وہ بنیں گے، دولت کی فراوانی ہوگی۔ جو چاہیں گے خریدینگے۔ اور جس طرح چاہیں گے خرچ کرینگے۔ لیکن حصول تعلیم کے بعد جب بیکاری ایک سوالیہ نشان بنکر اُن کے سامنے اپنا بھیانک منہ کھولتی ہے تو ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور خوش آیند توقعات کی منور شمع اس طرح گل ہو جاتی ہے گویا اب کبھی روشن نہ ہوگی۔

شارق باپ دادا کی وقتوں کی ایک آرام کرسی پر، جس کی بید جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی، آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اس کے خیالات حقیقت و ممکنات کی حدود توڑ کر کبھی پستی اور کبھی بلندی کی طرف پرواز کر رہے تھے وہ بہت دیر تک آہیں بھرتا رہا "ہماری شادی کو ایک ماہ ہوگیا ہے، مگر افسوس میں نے سعیدہ کو ایک چیز بھی لاکر نہ دی، اُف یہ آرزوئیں اور مفلسی!"

ڈاکئے نے ایک خط لاکر دیا جو اس کی عرضی کے جواب میں بمبئی سے آیا تھا۔ پڑھ کر اُسے یقین نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین اسکے پیروں کے نیچے سے سرک رہی ہے۔ اسے ملاقات کے لئے بلایا گیا تھا! کسی اور محکمہ نے اتنا بھی نہ کیا۔ یہی اُس کے لئے بہت تھا، مایوسی کے اندھیرے میں دُور، بہت دُور اُمید کا چراغ جلتا نظر آیا۔ اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ سچ مچ ملازم ہوگیا ہے اور اسکی جیب تنخواہ کے پچھتر روپیوں سے دبی جارہی ہے۔ ابتو غریبی کے بادل زندگی کے آسمان سے ہمیشہ کے لئے چھٹ جائینگے وہ سعیدہ کے لئے کیا کیا نہ خریدے گا؟ وہ تمام چیزیں، جو اس نے خوبصورت لڑکیوں کو استعمال کرتے دیکھی ہیں یا جن کے متعلق کتابوں میں پڑھا ہے۔ کیسے سہانے دن ہوں گے۔ وہ احتاجی سے بے نیاز، پریشانیوں اور خلفشار سے آزاد!۔

بمبئی ـــــ عروس البلاد۔ ایکٹرسوں پر جان دینے والوں کا خانہ طواف تجارت اور روزگار کی اُمیدگاہ، حسن و گناہ کا مرکز ـــــ شارق کے لئے ایک

نئی دنیا تھی۔ جدھر نظر اٹھاتا سر بفلک عمارتیں۔ عالیشان دکانیں، بجلی کی ریلیں، دیسی بدیسی آدمیوں کے انبوہ، بے پردہ و نیم برہنہ عورتوں کے جھرمٹ—— غرض اُسے اپنی بیداری پر شُبہ ہونے لگا اور وہ ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا

دوسرے روز ملاقات کے لئے وہ گیا۔ اللہ غنی ایک اسامی کے لئے۔ ڈھائی سو نوجوان قسمت آزمائی کے لئے آئے تھے۔ کاش اُن کے والدین نے۔ بی۔ اے کی ڈگری کو قرآن و حدیث کا حکم اور دولت و ملازمت کی گارنٹی نہ سمجھا ہوتا!! دوپہر کو جاکر کہیں اسکی باری آئی۔ ملاقات کرنے والے افسروں نے خاصے سخرے پن کا ثبوت دیا اور نہایت فضول سوال پوچھے۔ شام کو نتیجہ معلوم ہوگیا—— وہ منتخب نہیں ہوا۔ جیسے کوئی شکستہ پر ایک نازک شاخ پر آشیانہ بنا رہا ہو اور باد مخالف اسے اُجاڑ دے۔ اُس کا دل بجھ گیا اور وہ اپنی قیام گاہ پر واپس جانے کے لئے لوکل ٹرین کے انتظار میں سر نگوں بیٹھا تھا کہ ریل کی گڑ گڑاہٹ سُن کر اُس نے سر اونچا کیا تو دیکھا کہ ایک معمر شخص غور سے اُس کا جائزہ لے رہا ہے، یہ بمبئی کا ایک بڑا تاجر تھا جسکی تجارت دوسرے شہروں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ شارق خود بھی کھڑا ہوگیا اور اس کے سوالوں کے جواب میں اُس نے بمبئی آنے کا مقصد اور ناکامی کا ذکر کچھ ایسے پر تاثیر الفاظ میں کیا کہ سیٹھ بابا کو رحم آگیا اور وہ اسکے شانے پر ہاتھ رکھ کہنے لگے "تم کل دس بجے میرے کارخانے میں آؤ تمہیں سو روپے تنخواہ ملے گی"

(۲)

دفتر سے واپسی کے بعد، وہ کھڑکی کے پاس مونڈھا بچھائے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ آج اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دل سورج مکھی کی مانند کھلا ہوا تھا، اُس نے سوچا "نہیں، میں سعیدہ کو ابھی کوئی اطلاع نہیں کروں گا، ایک مہینہ

ختم ہوجائے تو میں ساری تنخواہ لیکر خود وہاں جاؤں گا۔ بیشک ایک مہینے تک کوئی خیر خبر معلوم نہ ہونے سے دونوں پریشان ہونگی۔ بلکہ سعیدہ کو تو شاید رونا بھی آئیگا۔ مگر جب میں دفعتاً وہاں پہنچوں گا تو وہ خوشی سے دیوانی ہوجائیگی ـــــــ" لیکن تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی، ہنس رہی تھی اس کی جوانی پر، سعیدہ کی کس مپرسی پر، زندگی کے حزن وطرب پر۔ انسان تقدیر سے لڑتا ہے، اُسے کوستا ہے، اُس کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے۔ مگر اُسے نہیں معلوم کہ وہ خود سراپا تلوّن ہے۔ اُس کی کسی چیز کو، معمولی سے معمولی احساس وجذبے کو بھی، ثبات نہیں، اُس کی کائناتِ حیات مستقل طور پر رنگ بدلتی رہتی ہے۔ ابھی کچھ، ابھی کچھ، ایک مسلسل بیقراری! ایک دائمی اضطراب وانقلاب! پھر وہ قسمت پر کیسے غالب آسکتا ہے، اور اسکے شکست کھانے پر فاتح تقدیر کیوں نہ خندہ زن ہو؟۔

یکایک اُس کے خیالات کو ٹھوکر لگی اور اُس نے غور سے دیکھا ـــــــ باہر سڑک پر ایک ایرانی نژاد دوشیزہ، حسن وجوانی سے بھرپور، مفلسی اور محتاجی کے بوجھ سے دبی ہوئی، کسی آنے جانے والے کے انتظار میں کھڑی تھی کہ دستِ سوال دراز کرے۔ اس کے تخیل کی ہردم آگے بڑھتی ہوئی رَو پیچھے ہٹی اور ہٹتی گئی۔ بمبئی میں اس کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ اور دلکش شے "حسین صورتیں" تھی، جو راہ چلتے بے باک وبے پروا اس کے دائیں بائیں سے نکل جاتی تھیں۔ یہ حُسن اس نے اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اور سعیدہ تو، گھروالی اور شریک زندگی کی تمام خوبیوں سے متصف ہونے کے باوجود اس دلفریب حسن سے بالکل محروم تھی۔ خوبصورتی کی اِس کثرت نے اس کے تصورات میں ایک طوفان بپا کردیا تھا۔ اور اُس کی جوانی اُبلتے ہوئے دُودھ کی طرح اس کی رگوں میں گردش کرنے لگی تھی۔ یہی کیفیت اسپر اُس وقت طاری ہوگئی اور وہ غیرارادی طور پر نیچے اس بھکارن کے پاس جانے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ جاتے جاتے

اُس نے سامنے رکھے ہوئے آئینے میں اپنا عکس پڑتا ہوا دیکھا۔ مگر اپنے چہرے پر شیطنت اور نفسانیت کے آثار نہ پہچان سکا۔

بھکارن کی وحشی و مخمور آنکھیں، چشمِ آہو کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں، شارق کو قریب آتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ جب اس نے ایک اکنّی دی اور اس نے اظہار تشکّر کے لئے نگاہ اونچی کی تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور اس نے چپکے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"گلناز" اُس نے سرگوشی کے لہجے میں جواب دیا۔

"میرے ساتھ چلو" شارق نے سامنے کی عمارت میں اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

وہ یونہی کھڑی رہی۔ شارق نے پھر کہا "تم بھوکی ہو" آؤ میں تمہیں کھانا کھلاؤں"

ایرانی النسل گلناز، جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کالے لباس میں ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے بدرِ منیر بادلوں کے جھرمٹ میں گھر گیا ہو۔ اس کا گلاب کی پنکھڑیوں جیسا نرم جسم، متناسب اعضا، سُرخ و سپید رنگ ایک قیامت کا سامان تھا۔ اُس کے روئیں روئیں سے حسن و جوانی ٹپکی پڑتی تھی۔ گویا قدرت نے ایک نغمہ حسن اور تیز مئے شباب گلناز کے سانچے میں ڈھال دی تھی۔ شارق نے اندر سے کنڈی لگالی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ گلناز بالکل نہیں گھبرائی۔ صرف ترچھی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرہ پر باوجود مسکینی کے جلال تھا۔ اُس نے اُس کے ہاتھوں کو نیچے کرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا "دروازہ کھول دو۔ میں جاتی ہوں"

شارق کا جوش اور بیتابی سرد پڑ گئی۔ گلناز کو اس طرح قابو میں نہیں کیا

جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک پُرفریب تجویز معاً اُس کے ذہن میں آئی۔ اور اس نے دروازہ کھولتے ہوئے آہستہ سے کہا " تم مجھ سے شادی کر لو ——— مجھے بیوی کی ضرورت ہے اور تمہیں پناہ کی۔"

گلناز نے اُسے سرتاپا معصوم نظروں سے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی " تمہاری شادی تو نہیں ہوئی ؟ "

شارق نے فوراً جواب دیا " نہیں تو۔"

گلناز کہنے لگی " یہ میں نے اس لئے پوچھا کہ ہم لوگ کبھی کسی کا گھر نہیں اُجاڑتے کیونکہ جو کوئی ایسا کرتا ہے، خود اس کا گھر بھی بسا نہیں رہتا۔"

شارق چپ چاپ سُنتا رہا۔

گلناز نے پوچھا " تم مجھ سے دغا تو نہیں کرو گے ؟ "

" کبھی نہیں " اُس نے جواب دیا۔ مگر دل میں کہا " مجھے تمہارا حسن اور جوانی چاہئے۔ اِس کا عوض تھوڑی سی چاندی ہے اور بس۔"

گلناز بولی " اچھا میں تم پر اعتبار کرتی ہوں، اپنا قول ہمیشہ نبھانا۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی اور عورت تمہارے بچوں کی ماں نہ بنے ——— نکاح کا انتظام کرو۔"

شارق نے جلدی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور ٹوٹے ہوئے سانسوں میں کہنے لگا " تم فکر نہ کرو۔ میں قاضی کو ابھی بلواتا ہوں " ——— وہ جھک کر اسکے احمریں لبوں پر اپنے لب رکھنا چاہتا ہی تھا کہ گلناز اسکی آغوش سے نکل آئی اور کرتے کے اندر سے خنجر کھینچ کر کہنے لگی " ذرا ٹھہرو۔ میرے آبا و اجداد کی رسم کے مطابق ہم دونوں ابھی ایک دوسرے کے ہوئے جاتے ہیں۔" اور پیشتر اس سے کہ شارق یہ سمجھ سکتا کہ وہ کیا کرنے والی ہے اُس نے اسکی کلائی پر ہلکی سی ضرب لگائی اور

پھر اپنی کلائی پر خنجر پھیرا - دونوں کلائیوں میں سے خون کی ننھی سی پھوار نکلی اور اس نے اپنی کلائی شارق کی کلائی سے ملا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آغا میں تمہاری لونڈی ہوں۔"

۳

باوجود حسن و خوبصورتی کے مفلسی کی بدولت گلناز کا اجلا بدن میلا ہو رہا تھا کثافت اور مہینوں نہ نہا سکنے کی وجہ سے اُس کے جسم سے بُو آ رہی تھی اور اپنی گندگی کا احساس اُسے شرم سے پانی پانی کیئے دے رہا تھا - اُس نے بمشکل کہا -

"میں نہاؤں گی ——— مجھے کوئی کپڑا دو۔"

شارق میں انکار کی جُرأت نہ تھی - اُسے غسل خانہ دکھا کر وہ اپنا ٹرنک ٹٹولنے لگا - سب کپڑے دیکھ چکنے کے بعد اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ اپنی دونوں تہمدیں اُسے دیدے، گلناز نہانے چلی گئی - اور یہ وقت اُس نے بڑی بے صبری سے گذارا، اسکی جذبات میں ہلچل مچی ہوئی تھی، تنفس تیز ہو گیا تھا اور آنکھوں میں معصیت کے شعلے بھڑک رہے تھے، جب وہ غسل کر کے باہر نکلی تو کسی حسن پرست مصور کا شاہکار اور منتہائے کمال معلوم ہوتی تھی، ایک تہمد سے زیریں اور دوسرے سے بالائی حصہ ڈھکا ہوا تھا، مگر یہ پوشش برائے نام تھی - اُس کا گلابی اور لچکدار جسم اس طرح چھلکا پڑتا تھا، جیسے ساغِ بلّوریں میں سے بادہ ناب!

جوں جوں دن گذرتے گئے اُس کی آتش شوق بڑھتی رہی، ملازمت وغیرہ کی مجبوری کے علاوہ اس کا ہر لمحہ پرستشِ محبوب میں گذرتا اور کبھی بھول کر بھی یہ خیال اسکے دل میں نہ آتا کہ وہ کنوارا نہیں بلکہ ایک اور عورت پہلے ہی اس سے ہمیشہ کیلئے متعلق ہو چکی ہے -

وہ دونوں اب میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے تھے، گلناز اس کے لئے کھانا تیار

کرتی، اور جب وہ شام کو تھکا ہوا واپس آتا تو ایک دلنواز تبسم سے اُس کا خیر مقدم کرتی۔ شارق رات کی تنہائیوں اور تنہائی کی فسوں کاریوں میں اُس شمع شبستاں پر پروانہ وار نثار ہوتا۔ کبھی اُس کے بالوں اور رخساروں اور کبھی ہونٹوں اور شباب سے لبریز باہوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ——— سارا مہینہ اسی طرح عیش و عشرت اور سیہ کاریوں میں کٹ گیا۔ تنخواہ جیب میں رکھے ہوئے وہ پُر رونق بازاروں میں سے گذرا تو اُسکی آرزوئیں مچلنے لگیں، لیکن سعیدہ کے لئے نہیں ——— وہ دکان در دکان مختلف اشیاء خریدتا پھرا۔ کاسنی، سیاہ، اور شفتالو کے رنگ کی ساڑھیاں خریدیں۔ ایوننگ ان پیرس ہیر آئیل، آئی سلما پاؤڈر، کولگیٹ لپ اسٹک، کیوٹی کیور اصابن، ۱۱۱۷ سینٹ اور ناخن رنگنے کے لئے کیوٹکس سٹ خریدا گھر پہنچکر اس نے تمام یہ سامان گلناز کے سامنے رکھ دیا۔ اور تھوڑی دیر تک، اپنے علم کے مطابق وہ اُسے ان چیزوں کا استعمال بتاتا رہا۔ بلکہ ان سے آراستہ ہونے میں اُسنے اُسکی مدد بھی کی۔

دن یونہی گذرتے گئے ——— جب وہ سنگھار کرکے سراپا روپ سروپ ہوتی تو شارق کے طوفانِ جذبات میں اور بھی بجلیاں کوندتیں ——— وہ اُس کے پہلو میں بیٹھ جاتا۔ اور اُس کے بشرے سے گناہ کے شرارے بکھرتے رہتے۔ لیکن گلناز کی محبت بالکل مختلف تھی۔ اُس کا جذبہ طوفانی نہیں بلکہ پُرسکون تھا۔ وہ اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرتی اور اسے ہر وقت مسرور رکھنا چاہتی تھی، جب وہ محبت سے بے قابو ہو جاتی تو اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتی اور مدھم سُروں میں کبھی حافظ کی غزلیں اور کبھی عمر خیام کی رباعیاں گانے لگتی۔ اور جب شارق اسکے حسن کی تعریف کرتا تو وہ بے حد خوش ہوتی اور اس کے چہرے کو بہت دیر تک ایک معصوم بچے کی طرح تکتی رہتی۔ لیکن اُس کی نظریں شارق کے خدوخال کی سطح سے نیچے کبھی نہیں گئیں۔ ورنہ وہ دیکھتی کہ اکثر خوبصورت نوجوانوں کی طرح جن کے حسن سے متاثر ہوکر بھولی

بھالی لڑکیاں اپنی راہ سے بھٹک جاتی ہیں، اس کا باطن آلودہ ہے۔

(۴)

بمبئی میں رہتے اُسے دو سال ہو گئے۔ کبھی کبھی کاروبار کی خاطر اُسے کچھ دن کے لئے باہر جانا پڑتا تھا اور اب کے کام کے سیلسلے میں اس کا قیام ایک ایسے شہر میں ہوا جہاں سے اُس کا وطن چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ گھر کے خیال سے اسکی طبیعت بڑی متوحش ہوئی۔ اگلے پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے اُسے یاد آئے ـــــ وہ زمانہ جب وہ طالب علم تھا اور خالہ اپنا پیٹ کاٹ کر اس کا خرچ پورا کرتی تھی، وہ دن جب اس کی شادی ہوئی، اور وہ رات جب سعیدہ سے سینکڑوں وعدے وعید کر کے رخصت ہوا۔ وہ سوچنے لگا "خالہ اور سعیدہ نہ جانے میرے متعلق کیا سمجھتی ہوں گی۔ میں نے واقعی اُن پر بڑا ظلم کیا ہے، اُن کو میرا پتہ تک معلوم نہیں۔ انھوں نے اُس محکمے کے ذریعے ضرور دریافت کروایا ہوگا جس نے مجھے ملاقات کے لئے بلایا تھا۔ مگر وہاں سے کیا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ مجھے گھر یقیناً جانا چاہیئے۔ سعیدہ سے سچ سچ کہہ کر معافی مانگوں گا۔"

جس وقت اُس نے اس سرزمین پر قدم رکھا، جس کی مٹی اور گلیوں میں وہ پل بڑھ کر جوان ہوا تھا تو اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور دماغ میں مختلف النوع خیالات چکر لگانے لگے، وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور اس کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہو گئی تھی۔ ایکا ایکی اُس نے دیکھا کہ گلی میں بہت سے بچے کھیل رہے ہیں، اُن میں ایک دو سالہ بچّہ، شارق کو دیکھ کر مسکرایا اور اس کی طرف ہاتھ اُٹھا دیئے۔ اُسے اس پر بہت پیار آیا اور لپک کر اس نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ سانولا رنگ، تنومند جسم، نکھرے پر فرشتوں کی سی جھلک وہ اُس سے باتیں کرنے لگا اور بچہ بھی اس سے اس طرح گھل مل گیا۔ گویا وہ اچھی طرح واقف ہے۔

شارق کو حیرت تھی کہ اُس کو کیوں اسپر آپ ہی آپ پیار آرہا ہے اور بچے نے بھی گود سے اُترنے کا نام نہیں لیا۔ فرطِ محبت سے اس نے اس کا رخسار چوما ــــــ سامنے سے ایک بُڑھیا آتی نظر پڑی۔

"ننھے میاں! ننھے میاں!!" ملازمہ نے بچے کو آواز دی۔

یہ ماسٹر نصیر الدّین کی پُرانی خادمہ تھی۔ شارق کو دیکھ کر وہ استعجاب میں ڈوبی ہوئی اُلٹے پیروں واپس ہوگئی۔

ماسٹر نصیر الدّین نے ساری داستان کہہ سنائی۔ شارق کے نہ آنے سے سعیدہ کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر بھی بچاری روز یہ انتظار کرتی کہ آج اُن کا خط ضرور آئیگا جب کوئی اُمید نہ رہی تو ماں بیٹوں کی حالت پاگلوں کی سی ہوگئی۔ سعیدہ جلاپے میں چل بسی اور اس کی ماں کے لیئے یہ صدمہ مرسے پر سو دُرّے ثابت ہوا۔ نصیر الدّین کی بیوی اولاد سے محروم تھیں۔ اُنہوں نے بڑے لاڈ پیار سے اس بچے کی پرورش کی ــــــ جسے شارق سینے سے چمٹائے زار و قطار رو رہا تھا۔

چلتے وقت شارق نے دونوں میاں بیوی کی مہربانی اور خدا ترسی کا انتہائی عاجزی سے شکریہ ادا کر کے کہا "اب میں اسے اپنے سے جدا نہیں کروں گا" اور جب وہ اسے لے جانے لگا تو نصیر الدّین کی بیوی کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں اور انہیں محسوس ہوا کہ کوئی اُن کا کلیجہ نکال کر لئے جا رہا ہے۔ سچ ہے پال کی آگ پیٹ کی آگ سے زیادہ ہوتی ہے۔ پر وہ بیچاری کر کیا سکتی تھی، دوسرے کی ملکیت پر کسی کا کیا زور؟ اُس نے اُسے نہلا دُھلا کر، سب سے اچھا جوڑا پہنایا، آنکھوں میں سُرمہ اور ماتھے پر ٹیکا لگایا، گویا وہ اپنے لال کو دولھا بنا کر رخصت کر رہی ہے۔

جب وہ دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو اس نے طنبورہ بجنے اور کسی مرد کے گانے کی آواز سنی، وہ بڑا متحیر ہوا۔ کمرے میں گھس کر اس نے دیکھا کہ گلناز طنبورہ بجا رہی ہے اور ایک بلوچی اس کے قریب بیٹھا ہوا ایرانی لہجے میں گا رہا ہے۔ اُس کے تن بدن میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی، اور وہ طیش میں آ کر چیخا "گلناز"

گلناز موسیقی میں بیخود تھی، شارق کی آواز سنکر چونکی اور حسب معمول اسے دیکھ کر مسکرائی۔ مگر شارق پر اس دفعہ اس تجلّی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اس نے غصّے میں اُسے بہت سخت سُست کہا۔ گلناز نے پہلی بار اُسے خشمناک نگاہوں سے دیکھا، لیکن ضبط کرتے ہوئے اسکی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کہنے لگی:۔

"آغا! ہم بلوچی ہیں اور ہم لوگ ایک دوسرے کے لئے خواہ کتنے ہی انجان کیوں نہ ہوں لیکن سب ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔ میں نے اُسے یہاں سے گذرتے ہوئے دیکھا تو مجھے اپنے قبائل کی آزادیاں اور خانہ بدوشوں کی رنگ رلیاں یاد آ گئیں۔ اسی لئے میں نے اُسے یہاں بُلایا کہ ہم ایک دوسرے کو اپنی باتیں سنائیں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے شارق جیسا پرستار ملا ہے، پر افسوس ——— تم نے میری ناموس پر شک کر کے ایسے جملے کہے ہیں جن کو ہم لوگ کبھی معاف نہیں کرتے۔"

پھر اُس نے اشارے سے بلوچی کو الوداع کہا اور اس کے جانے کے بعد مرجھائے پھول کی طرح جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ شارق کا غصّہ فرو ہو گیا اور اُس نے اُسے محبّت سے پکارا۔ "گلناز"

گلناز جو اُس کی گود میں کن انکھیوں سے بچے کو دیکھ رہی تھی آہستہ سے کھڑی ہوئی اور جواباً بولی۔ "یہ کون ہے؟"

شارق کی آواز ندامت اور رنج سے بھرّا گئی اور اُس نے بمشکل تمام اُسے اصل واقعہ سے آگاہ کر دیا۔ اور قدرے ٹھہر کر ذرا تحکمانہ انداز میں بولا ——— اور

یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی ——— "اگر تمہیں میرے پاس رہنا ہے تو تمہیں اِس کی پرورش کرنی ہوگی .... یہ میرا بچہ ہے۔"

وہ اس طرح خاموش کھڑی رہی۔ گویا شارق کے حکم کے آگے اُس کا سرِ تسلیم خم ہے۔ مگر آنکھوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں غصّے اور حقارت کے چشمے اُبلے پڑ رہے ہیں اور جب یہ کوہ آتش فشاں پھٹے گا تو جو کوئی بھی اس کی زد میں ہوگا ہلاکت و تباہکاری سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔

جب کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے اور بچہ گہری نیند سو گیا تو شارق نے گلناز سے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "چلو سونے چلیں۔" ——— بچے کو بھی اوپر لیتی چلو۔"

گلناز نے ایک قہقہہ لگایا۔ ایسا قہقہہ جو فضا میں تحلیل ہونے سے پہلے ایک غیر مرئی نصف دائرہ بناتا گیا، اور پھر ایک عجب انداز سے کہنے لگی۔ "تم اوپر چلو ——— میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

شارق ایک رندِ خراباتی کی طرح بالائی منزل پر جا کر سفید پوش پلنگ پر بیٹھ گیا۔ رات پُرسکون اور خوشگوار تھی، قمر چہاردہم اپنی پوری تابانی سے جلوہ فگن تھا۔ اس کی کرنیں، چینی کے ٹکڑوں سے مرصّع فرش پر منعکس ہو کر نور و سرور کا سماں پیدا کر رہی تھیں، اُس نے بیقرار ہو کر آواز دی۔ "گلناز!"

جواب میں ساز کے تاروں کی جھنکار پیدا ہوئی اور گلناز بلوچن کے لباس میں طنبورہ ہاتھ میں لئے مست ہرنی کی طرح چلتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شارق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھانا چاہا۔ مگر وہ کھڑی رہی اور اُس کا تن سیمیں متحرک ہونے لگا گویا وہ آمادۂ رقص ہے۔ وہ شلوار جیسی بڑے گھیر کی پشواز اور لانبا کرتا اور سر پر اودا کسادا باندھے ہوئے تھی۔ اُس نے ناچنا شروع کیا۔ اس ادا سے

ہوتا تھا کہ اس کے ایک ایک عضو سے چنگ و رباب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔
اِس سے پہلے گلناز نے کبھی اپنا اصلی لباس نہیں پہنا تھا اور نہ کبھی اسکے سامنے ناچی تھی،
چند ہی لمحات میں اسکی صاعقہ باریوں نے اُسے مسحور کر لیا اور اُسکے خفتہ جذبات بیدار ہو گئے
وہ کھڑا ہوا اور اسے اپنی آغوش میں لے لینے کے لئے۔ اُس کے ساتھ ساتھ اِدھر سے
اُدھر پھرنے لگا، مگر وہ ہر ہر بار اُس کے پہلو سے نکل نکل جاتی اور جب وہ پورے
جوش کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دھن میں کھوئی ہوئی ناچ چلی گئی تو شارق
بے قابو ہو گیا اور چاہتا تھا کہ اس کو اپنی گرفت میں لے لے کہ گلناز نے بجلی کی مانند لہرا کر
طنبورہ پھینک دیا اور خنجرِ آبدار نکال کر اپنے سینہ میں بھونک لیا طنبورے
کے تاروں نے جیسے اس نے نہایت زور سے فرش پر پھینکا تھا، صورِ اسرافیل جیسا ہنگامہ
بپا کیا اور خاموش ہو گئے۔

شارق نے بہتا ہوا خون دیکھا۔ اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور کئی ساعت
تک وہ پتھر کے بُت کی طرح گُم سُم کھڑا رہا۔ پھر وہ جھکا اور اس کا سر اپنی گود میں لیکر شکستہ آواز
میں کہنے لگا۔ "گلناز! تم نے یہ کیا کیا؟"

وہ مُسکرائی۔ لیکن اُس مسکراہٹ میں تنفّر پنہاں تھا۔ وہ آہستہ بولی
"تم نے مجھے دھوکہ دیا اور میری عصمت پر الزام لگایا۔ میں نے تم سے دونوں
باتوں کا انتقام لے لیا ہے........ ہم بلوچی ہیں اور بلوچی انتقام لئے بغیر
نہیں رہتے۔ تم نے میرے ناموس پر حملہ کیا، اُس کا بدلہ میں اپنی جان گنوا کر لے رہی
ہوں۔ علاوہ ازیں تم نے مجھے دھوکہ دیکر نکاح پر راضی کیا۔ حالانکہ تمہاری شادی
ہو چکی تھی۔ گویا تم نے مجھے بیوی نہیں بلکہ جوانی کی شراب سمجھا، لیکن اب تم اس سے
اپنی پیاس نہ بجھا سکو گے ——— اور اس فریب کا انتقام! ؟ ———
آہ تمہارا بچہ!! ———

گلناز سے آگے کچھ نہ کہا گیا - اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اس نے وہیں دم توڑ دیا -

شارق بھاگا ہوا اگلی منزل میں گیا تو دیکھا دیکھا کہ بچے کے گلے میں گلناز کے ریشمی رومال کا پھندا لگا ہوا ہے اور سرہانے ایک چھری گڑی ہوئی ہے - جو بلوچن کے ہولناک انتقام کا اعلان کر رہی ہے -

۱۹۳۹ء

نالۂ دل

شہر کی پُر تصنع اور گھناؤنی زندگی سے اکتا کر ایک روز چند احباب نے، جو قریب قریب سب ہی تعلیم یافتہ تھے۔ اور اچھا مذاق رکھتے تھے، یہ طے کیا کہ کچھ دن دنیا کی اس گہما گہمی سے کہیں دور گذارے جائیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے شہر سے میلوں پرے ایک گاؤں سے ذرا ہٹ کر دامنِ کوہ میں خیمے لگا دیئے۔

یہ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ ہم لوگ الاؤ کے گرد آگ تاپنے بیٹھے ہوئے تھے کہ احباب کی باتیں اس فیصلے پر ختم ہوئیں "اپنا کوئی افسانہ سناؤ"۔

میں ذرا اونگھنے سا لگا تھا۔ یہ سنکر ہوشیار ہوا اور کہا "میں افسانہ گو تو نہیں ہوں۔ اور لکھا ہوا افسانہ میرے پاس ہے نہیں"۔ مگر آپ جانیئے پڑھے لکھے بے تکلف دوستوں کا اصرار کہیں ٹالا جاتا ہے؟ چار و ناچار ذہن اِدھر اُدھر دوڑایا اور اتفاق کی بات مجھے ایک کہانی سوجھ ہی گئی۔ رات کافی جا چکی تھی اور ہر طرف مکمل سکوت

طاری تھا، البتہ گاہے گاہے آگ میں سوکھی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں رات کی خاموشی کو ذرا دیر کے لئے توڑ دیتی تھیں۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے ہمراہی میری طرف آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں تو میں نے اپنا افسانہ یوں شروع کیا:۔

(۱)

اُس سال دلّی میں غضب کی سردی پڑی تھی۔

ایک دفعہ دن ڈھلے میں کسی تنگ و تاریک گلی میں سے گذر رہا تھا کہ ایک شخص کے کراہنے کی آواز سنی۔ اُس کی دلدوز چیخوں نے میرے قلب پر بےحد اثر کیا اور میں ذرا سوچنے لگا کہ رکوں یا نہ رکوں کہ اُس نے ایسے لہجے میں جو عجز و انکسار میں ڈوبا ہوا تھا مجھے پکارا اور اس کے بعد پھر اس کے رونے کی آواز آنے لگی میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ ایک نحیف و زار بوڑھا ایک کونے میں سمٹا سمٹایا پڑا ہوا ہے اور اس کی غم زدہ حالت اُس کی بیچارگی کا اعلان کر رہی ہے۔ پاس کی نالی میں اس کے پاؤں جا پڑے تھے۔ اور اُس میں اتنی سکت بھی باقی نہ رہی تھی کہ ٹھنڈ سے بچنے کے لئے نالی کے پانی میں سے اپنے پاؤں باہر نکال لے میں نے اُس کے بالائی حصے کو دیکھا تو ایک چیتھڑے لگے ہوئے انگرکھے میں اس کا جھرّیاں پڑا ہوا بدن سردی میں اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کسی کی رعشہ زدہ گردن۔ اُس کے جسم میں جو زخم پڑے ہوئے تھے اُن کی عفونت اتنی تیز تھی کہ اس اثنا میں جو لوگ وہاں سے گذرے وہ راستہ کاٹ کر نکلے۔ میں یوں تو سخت دل ہوں لیکن نہ جانے اُسے دیکھ کر میرے دل میں رحم کا سمندر کیوں اُمنڈ آیا۔ اُس کے پاس پہنچکر پہلے میں نے اُس کے پاؤں نالی میں سے نکال کر اپنے مفلر سے اُنہیں خشک کیا اور پھر سہارا دیکر اُسے ذرا ڈھنگ سے بٹھایا اور یہ محسوس کر کے کہ وہ سردی سے بُری طرح کانپ رہا ہے اپنا کوٹ اُسے پہنا دیا۔ جب اس میں

کچھ گرمی آئی تو اُس نے اپنی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور مجھے دیکھ کر قدرے حیرت سے کہنے لگا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "تم ہی نے تو بلایا تھا۔"

اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مسکرانا چاہتا ہے۔ مگر اُس کے ہونٹوں نے اُسے پوری طرح مسکرانے نہیں دیا۔ چنانچہ وہ نظر ٹھہرا کر بولا۔ "سب ہی کو بلاتا ہوں ——— مگر میرے پاس کوئی بھی نہیں آتا۔ پھر تم کیوں چلے آئے؟ کیا تمہیں مجھ سے گھن نہیں آتی؟"

میں نے متاثر ہو کر آہستہ سے کہا۔ "نہیں مجھے تم سے گھن نہیں آتی۔ تمہاری پکار سُنکر میرا جی چاہا کہ تمہارے پاس آجاؤں ——— بولو، کیا بھوکے ہو؟"

"ہاں" اُس نے ہولے سے کہا۔ "آخر تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ جب سے در در کی بھیک مانگنی نصیب ہوئی۔ مجھے تو ہر جگہ سے دھتکار اور جھڑکیاں ہی خیرات میں ملیں۔ آج پہلا موقع ہے کہ کوئی مجھ پر ترس کھا رہا ہے .... آہ یہی تو میرے دل کی تمنا تھی کہ مرنے سے پہلے مجھے کوئی ہمدرد میسّر آجائے۔"

یہ کہکر وہ چپکا ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ دو بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ کر اُس کی ڈاڑھی میں گم ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے خود ہی پوچھا۔ "تم نے نواب جعفر کا نام سنا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

اسپر وہ آپ ہی رُک رُک کر کہنے لگا :-

"تم نواب جعفر کو نہیں جانتے! ——— لوگ اس کو دولت کیوجہ سے نواب کہا کرتے تھے۔ بہت مخیر اور نیک دل شخص تھا۔ عابد و پرہیزگار بھی۔ اُس کی دلہن کو اُس کے گھر آئے چار سال ہو گئے تھے اور دلہن بھی کیسی، موہنی مورت، کامنی

صورت، تابع فرمان، اور وفا شعار!- دونوں میں بڑی محبت تھی- مگر جب کبھی وہ آپس میں کھلکھلا کر ہنستے، قسمت نہ جانے کیوں رونے لگتی- ایکبار وہ بیمار ہوگئی اور ایسی پلنگ پر پڑی کہ پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا- آسمان کروٹ بدل رہا تھا اور تارے مدھم ہو چکے تھے کہ اُس نے اپنی تین سال کی سوتی ہوئی بچی کو بصد حسرت ویاس پیار کیا اور شوہر سے کہنے لگی "کب تک روتے رہوگے؟ دنیا ایک سرائے ہے جہاں دو مسافروں کی جان پہچان ہوگئی اور بس- پھر جب وقتِ سفر آیا تو دونوں علیحدہ ہوگئے"

"صرف سرائے؟" جعفر نے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے کہا "کیا ہم دونوں صرف مسافر ہی ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہی پڑیگا؟"

"کیا خبر؟" وہ اپنے محبوب شوہر کے رخسار پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی "اگر دونوں ہمیشہ ہمیشہ آپس میں ساتھ رہنے کا تہیہ کرلیں تو ——— شاید اُن کا ساتھ پھر بھی ہو سکے!"

"میں تو تہیہ کرچکا ہوں" جعفر نے بے قابو ہوکر کہا "ہم دونوں تو ساتھ ہی رہیں گے- ہمیشہ ہمیشہ! لیکن تم یہ باتیں ———؟"

"دیکھو!" وہ اپنی بچی کو بیچارگی سے دیکھتی ہوئی بولی "بجھی ہوئی شمع کی یادگار یہ پروانہ!! کیا تم اسے کلیجے سے لگا کر نہ رکھوگے؟ ——— کون جانے میں کب تک کی مہمان ہوں ——— شمع اب جھلملانے لگی ہے، مجھ سے ایک وعدہ کرو...... میرے بعد یہ بچّی تمہاری محبت کی ہمیشہ مرکز بنی رہے گی نا؟"

"تم یہ کیا کہہ رہی ہو دلہن؟" اُس نے اُس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے "تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤگی! اور یہ ——— یہ بچّی، ہماری اور تمہاری بچّی، بھلا اور کون اس محبت کا شریک ہو سکے گا؟"

"ہاں" ـــــــــ اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے چہرہ پر ایک افسردہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ گویا کوئی تھکا ہارا مسافر اپنی منزل پر آپہنچا ہے۔

"اسے پیار کرو، اپنی اور میری بچی کو!"

اس کے بعد؟ ـــــــ جب دلہن مرگئی اور وہ بچّی گہوارۂ الفت سے نکال کر دشتِ تنہائی میں پھینک دی گئی ـــــــــ اس کے بعد؟ ہاں، جعفر جوان تھا! جوان ہی کہہ لو کہ اب مطلبی لواحقین نے حسین و جمیل صورتیں دکھا کر اسکی زندگی کے سمندر میں جوانی کا تموّج پیدا کر دیا تھا۔ ہر روز تقدیس کا معبد مسمار کرکے پاپ کا مندر تعمیر کیا جانے لگا اور وہی جعفر جسے خدا کا خوف راتوں کو بے چین رکھتا تھا، اب گناہ کی زندگی گذار رہا تھا۔ بیوی کی موت کہنی کی چوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ دلہن کے مرنے پر کہاں تو وہ اپنی بھی قبر اس کے مرقد کے پاس تیار کروا رہا تھا اور کہاں یہ حالت کہ بچی کا نام بھی اُسے سوہانِ روح ہونے لگا۔ اُسی شہر میں اس کی نظریں ایک لڑکی پر پڑیں جس کا جمالِ جہاں سوز اسکے دل میں گھر کر گیا۔ اور اس نے اُس کے حصول میں تمام کوششیں صرف کر دیں مگر لڑکی والے کہتے تھے کہ رنڈوے سے وہ صرف ایسی صورت میں شادی کر سکتے ہیں کہ اس کی کوئی اولاد زندہ نہ ہو۔ جعفر کا دل یہ سنکر دھک سا رہ گیا۔ اِس لئے نہیں کہ اسے صدمہ ہوا بلکہ اس لئے کہ یہ بچی زندہ ہی کیوں ہے جو اس کی جوانی کی لہر کے ساحل تک پہنچنے میں حائل ہو رہی ہے۔ دن بھر وہ جز بز ہوتا رہا، بھنویں سکڑ کر یک جا ہو گئیں اور پیشانی پر بل پڑ گئے۔ آخر بدی نے نیکی پر سرابی فتح پالی اور اس نے ماضی کے روح فرسا دھندلکے کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

جب رات کافی جا چکی تو وہ بچّی کے کمرہ میں داخل ہوا اور دیکھا کہ آیا کے پلنگ کے پاس ایک چھوٹی سی مسہری میں معصومہ دنیا کی الجھنوں سے بیخبر

پڑی سو رہی ہے۔ آج ہی آیا نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے تھے اور وہ اسوقت بہت ہی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اُسے چپکے سے کندھے لگایا اور آہستہ سے ایک طرف چلدیا۔ برسات کی اندھیری رات تھی جب اُلّو بھی وحشتناک تنہائی سے خائف ہو کر ٹوٹی پھوٹی قبروں میں پناہ لینے چھپ جاتے ہیں۔ بجلی رہ رہ کر چمک اور بادل گھر گھر کر گرج رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ آبادی سے بہت دور نکل گیا۔ جہاں ہو کا عالم تھا۔ ایک جگہ پہنچکر اُس نے چاروں طرف غور سے دیکھا اور پھر اُس چار سال کی بچّی کو ایک عمیق گڑھے میں جسے وہ پہلے ہی کھود گیا تھا، اُتارا۔ بچّی جاگ اُٹھی اور باپ کی صورت بجلی کی چمک میں دیکھ کر ہمکنے لگی۔ "بابا تم مجھے اب پیار کیوں نہیں کرتے؟ میں تمہیں یاد کرتی رہتی ہوں۔ اور تم میرے پاس بھی نہیں آتے؟"

سنگدل جعفر نے سُنی اَن سُنی ایک کرتے ہوئے گڑھے کو مٹی سے بھرنا شروع کیا اور وہ عاجزی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہتی رہی "بابا! تم میرے کپڑے کیوں خراب کر رہے ہو؟ ...... دیکھو! میرے گندھے ہوئے بالوں میں مٹی گھسی جا رہی ہے" پھر اُس نے دردناک لہجے میں کہا "بابا! میرا دم گھٹا جا رہا ہے، مجھے نکالو...... !" لیکن اُس دم اسکی مکروہ روح گناہ کے شعلوں پر ناچ رہی تھی اسلئے اس کی فلک شگاف چیخیں سنتے ہوئے بھی میں ——— آہ — میں اُسے دفن کرتا رہا......"

"تم؟ ...... کیا، کیا کہا؟ ...... تم ہو، وہ جعفر......؟" میں جو بُت بنا ہوا اُس کی باتیں سُن رہا تھا حیرت و استعجاب میں یکلخت کہہ اُٹھا۔

"ہاں!" اُس نے اِس طرح کہا گویا وہ اپنے آپ کو قابل نفرت سمجھ رہا ہے "میں ہی ہوں وہ بے درد جس نے اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو ——— اپنی مرحوم

بیوی کی یادگار بچّی کو ——— اِن ہاتھوں سے زندہ پیوندِ خاک کیا ہے۔ اور تم کہتے ہو، تمہیں مجھ سے نفرت نہیں!......"

مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میری قوتِ ادراک سلب کرلی ہے۔ میں نے اُس کے گھناؤنے جسم پر ایک نگاہ ڈالی ——— وہ سردی سے اکڑ رہا تھا۔ اور چہرہ پر موت کی بے رونقی چھا چلی تھی۔

"اِس کے آگے بھی سنو!" اُس نے اپنی ایک طرف جھکی ہوئی گردن بمشکل تمام ذرا سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "جس وقت میں اُسے تہ خاک کر رہا تھا۔ اُس کے دل سے درد بھرے ہوئے نالے نکلنے۔ جنہوں نے عرش کے کنگورے ہلا دیئے اور قہرِ خداوندی جوش میں آگیا۔ کہیں دور ایک زبردست کڑاکے کے ساتھ بجلی گری۔ جس نے آس پاس کے درختوں کو جلا کر خاک کردیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قدرت میری المناک تباہی کی پیشین گوئی کررہی ہے۔ چنانچہ پیشتر اس سے کہ میرے خواب عملی جامہ پہنتے مین نے سنا کہ اُس لڑکی کی شادی کسی اور سے ہوگئی ہے۔ اِدھر میرے خود غرض لواحقین جنہیں میں اپنا ہمراز اور رفیق سمجھتا رہا، بچی کے قتل کا راز فاش نہ کرنے کی قیمت پر قیمت طلب کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کا زیادہ تر حصّہ اُن کی نذر ہوگیا۔ اُن ہی دنوں میرے جسم میں زخم پڑنے شروع ہوئے۔ جن میں سے اکثر نے ناسوروں کی شکل اختیار کرلی۔ رہی سہی پونجی معالجہ پر صرف ہوگئی۔ مگر افاقہ ہونے کی بجائے مرض مہلک تر ہوتا گیا۔ پھر ایک دن وہ آیا جب زخموں کے تعفن کی وجہ سے لوگ میرے پاس آتے ہوئے بھی بھاگنے لگے۔ اور جب میں رسیدہ درخت کی طرح بے یار و مددگار رہ گیا تو ضمیر نے بیدار ہوکر میری یہ حالت کردی کہ......"

اتنا کہہ کر نواب جعفر کی گردن نیچے ڈھلک گئی۔ اور اُس کی ناک کا بانسہ بھر گیا۔

یہ دیکھ کر میں نے اُسے اُٹھایا اور جسقدر جلد ہو سکا ایک قریب کے ڈاکٹر کے ہاں لے گیا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کر کے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کچھ کہا اور چپکا ہو گیا۔

(۳)

افسانہ ختم کر کے میں نے اپنے احباب پر، جو بجھی ہوئی چنگاریوں کو کریدنے لگے تھے، ایک نظر ڈالی اور کہا "اچھا ہوا، اُس نے دنیا ہی میں اپنے کیئے کی سزا بھگت لی اب اسکی روح کو سکون و اطمینان ہو گا۔ خدا مغفرت کرے"۔

ایک دوست جواباً بولا "شاید خدا اس کی مغفرت نہ کرے۔ اُس کا جرم بھی تو دیکھو، کس قدر سنگین تھا!"

"میں تو مکافاتِ عمل کا قائل ہوں" میں نے کہا "میری رائے میں کسی کے انجام سے ہم اُسکی حیاتِ آخرت کا تھوڑا بہت اندازہ لگا سکتے ہیں"

میرے ایک دوسرے دوست جو فاضلِ دینیات تھے آگے بڑھکر کہنے لگے "لیکن تمہارے پاس اس مقدس آیت کا کیا جواب ہے:۔

"قیامت کے روز، اُس بے گناہ بچّی سے جسے زندہ دفن کر دیا گیا تھا پوچھا جائیگا "آخر تجھے کس جُرم میں قتل کیا گیا؟"

میں نے گردن نیچے جھکا لی۔ میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سنہ ۱۹۳۷ء

دُھندلکا

یہ غریبوں کی بستی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ سامنے اُس خاک سے اٹے ہوئے طاق میں جس کی کمر بڑھاپے سے دُوہری ہو گئی ہے، ایک شمع چُپکے چپکے رو رہی ہے۔ اُس کے آنسو اُس کا جسم لاغر کئے دے رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ چند پروانوں کو اس کے شعلۂ حسن نے جلا کر خاکستر کر دیا ہے اور اُن کی لاشیں اُس مجبورِ محض شمع کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کاش میں نے کبھی محبت کی ہوتی۔ کبھی کسی نے مجھے بھی اپنی آتشِ عشق میں جلایا ہوتا۔ پھر اس وقت میں اُس لذت کو سمجھ سکتا جو پروانے کو جل مرنے میں محسوس ہوتی ہے! دیکھو! شمع پروانے سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہی ہے؛ "پیارے! میں تجھ سے ہمکنار نہیں ہو سکتی تھی)۔ تو نے ناحق جان گنوائی۔ لیکن دیکھ میرے محبوب! تیری یاد مجھے بھی تو جیتا نہ چھوڑے گی!"

میرا تخیّل مجھے ایک شہر میں لیجاتا ہے - یہاں امیر لوگ رہتے ہیں- عالیشان مکانات ہیں، بجلی کے قمقمے ہیں- پروانے یہاں بھی آتے ہیں- اُن کے گرد طواف کرتے ہیں مگر اُن کے پر نہیں جلتے- ان میں سوزش نام کو نہیں ہوتی- اور ہو بھی کیسے؟ یہ شمع تھوڑی ہے- یہ تو بڑے آدمیوں کے ہاں خوبصورتی سے آراستہ کئے ہوئے بجلی کے قمقمے ہیں- جن کے سروں میں غرور اور تکبر کا سودا سمایا ہوا ہے- ایک پروانہ دیوانہ وار آیا اور قمقمے سے پیہم اپنا سر ٹکرانے لگا- قمقمے کا مزاج برہم ہوگیا- اُس نے خشمناک ہوکر کہا "ارے دیوانے! کیوں میرا اُجلا بدن میلا کرتا ہے؟ ایسا ہی مرنا ہے تو وہ سامنے دیکھ- آتش دان میں اپنا جسم جُھلس لے"

اللہ رے تفاوت! پروانے کی جان جانے پر شمع روئے اور قمقمہ برہم ہوا!

(۱)

میں اِس قصبہ میں ایک ہفتہ سے مہمان ہوں- سرِ شام لوگ اِدھر اُدھر سے آکر میرے پاس جمع ہوجاتے ہیں- باتوں باتوں میں اُنھوں نے مجھے ایک دیہاتی لڑکی کے واقعات بتائے- جن سے میں نے ایک کہانی مرتّب کی- آج کی صحبت میں میں آپ کو اُسی الھڑ معصوم کی داستان سناتا ہوں-

اُس کا نام کلثوم تھا- وہ اور اُس کی ماں، دونوں اس بوسیدہ مکان میں رہتے تھے- ایک چکّی اُن کی ملکیت تھی- آس پاس کے لوگ اُس کی ماں سے گیہوں پسواتے تھے جس کی مزدوری اُس کو سیر سوا سیر میں ایک مٹھی مل جاتی تھی- اسی پر ان کا گذارہ تھا- تھوڑے فاصلے پر شہر والوں کا سا ایک پختہ مکان بنا ہوا تھا- اس میں یہاں کا زمیندار اور اس کے گھر والے رہتے تھے- بچپن میں سب کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے- اِس لئے زمیندار کا بیٹا غریب کسانوں ہی کے بچوں میں کھیلتا تھا- کلثوم سے اُس کا اُنس آہستہ آہستہ اسقدر بڑھ گیا کہ اُس نے اُسی کو اپنا

ہمجولی منتخب کیا۔ کھیل کا وقت نہ بھی ہو تب بھی وہ دونوں دھان کے کھیتوں یا پست منڈیروں کے پیچھے کھیلتے ہی نظر آتے تھے۔

پھر انھوں نے بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھا۔ لیکن اب بھی وہ دونوں غیریت جنسی سے ناواقف کسی گوشۂ تنہائی میں گھنٹوں گزار دیتے تھے۔ ایک دفعہ شام ہونے کو تھی۔ سورج تھکے ہارے مزدور کی طرح سستانے کے لئے پہاڑیوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ چرواہے گلّوں کو ہنکاتے اور پرانی بانسریوں پر ٹوٹی ہوئی لَے میں گیت گاتے چلے جا رہے تھے۔ ذرا دور ایک ندی اس طرح بے چینی سے بہہ رہی تھی گویا اس کا سانس کوئی دم میں رکا ہی چاہتا ہے۔ عابد، کلثوم کے بالکل قریب سرک آیا اور وہ بھی اپنی حیثیت سے بے خبر اس کے پہلو سے چمٹی ہوئی سرور سا محسوس کرنے لگی۔

عابد بولا " ایک بات کہیں ؟"

" ہاں " کلثوم نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

" ہم ——— ہم جا رہے ہیں "

" کہاں ؟ "

" ابا کہتے ہیں پڑھنے لکھنے سے آدمی ہیرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ مجھے پالم پور بھیج رہے ہیں "

" پالم پور ! " وہ ہولے سے بولی " وہ تو بہت دور ہے "

" ہاں ——— ابا نے کہا ہے وہاں اسکول اور کالج ہیں۔ جب ہم پڑھ لکھ جائیں گے تو سرکار ہماری بات مانا کرے گی اور...... "

" کے دن میں آ جاؤ گے ؟ "

" دن ؟ " اس نے ذرا شوق سے کہا " اری کئی سال لگ جائیں گے......

تم ہمیں بہت یاد آؤ گی۔"

"جانا کب ہے؟"

"کل منہ اندھیرے۔"

(۲)

کئی سال بیت گئے۔ پر دیہات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سوائے اسکے کہ کلثوم اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے کچھ بدلی بدلی نظر آتی تھی۔ اس کی ہستی کا آبگینہ دکھ کی چٹان سے پہلی بار ٹکرایا تھا۔ اِس لئے وہ سمجھنے لگی تھی کہ زندگی گریہ مسلسل ہی کا نام ہے۔ اُس کا دنیا میں اب کوئی نہیں تھا جس کے سہارے وہ اطمینان سے بیٹھی رہتی۔ وقت موت کا سب سے بڑا مرہم ہے۔ چنانچہ جب اس کے آنسو خشک ہونے لگے تو اُس نے ایک روز بیکسی سے اپنی چکی کی طرف دیکھا۔ وہ بیچاری خود اُسے حسرت سے تک رہی تھی۔ کلثوم اس سے لپٹ گئی۔ کچھ دنوں پہلے کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا کہ ماں نور کے تڑکے گیہوں کے دانے پاٹ میں ڈالتی اور دھیمے سروں میں گاتی جا رہی ہے۔ اس نے جھک کر کھردرے پتھر کو بوسہ دیا اور قدرے اطمینان سے غمناک آواز میں کہنے لگی۔ "میری جان! جب تک تو موجود ہے مجھے دو روٹیوں کی کمی نہیں۔" پھر یکبارگی کسی خوف اور مایوسی نے اُسے بوجھل دُھند کی طرح ملفوف کر لیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ اور وہ بھٹکتے ہوئے مسافر کی طرح خالی الذہن ہو گئی۔۔۔۔ کہ یکایک اس نے دیکھا کہ دھندلکے کے اُس پار کوئی چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ اسکی آس بندھ گئی۔

چند ماہ بعد عابد بھی اپنے باپ کی جگہ زمیندار بنکر آ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مکان آج خالی نظر آ رہا ہے۔ گویا یہاں کبھی کوئی بسا ہی نہیں۔ باپ کی جدائی کا اُسے بڑا رنج تھا۔ لیکن اتنا نہیں جتنا کلثوم کو۔ کیونکہ شہر کی دلچسپیوں نے اسکے

خیالات ایک مرکز پر مجتمع نہیں رہنے دیئے تھے۔ دو چار روز میں ہجوم کار سے فرصت ملی تو اسے کلثوم یاد آئی۔ سوچا اب تو وہ شباب سے بھرپور، دوشیزۂ بہار کی مانند ہوگی۔ شام ہوتے وہ اس سے ملنے اس کے گھر پہونچا۔

کلثوم کی جوانی انگڑائی لیکر بیدار ہوئی۔ جب سے اُس نے عابد کے آنے کا حال سنا اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اُس نے کئی بار سوچا "چلی چلوں، مجھے دیکھ کر بچپن کی تمام باتیں انہیں یاد آجائیں گی اور وہ میری ٹھوڑی اٹھا کر کہیں گے۔ کلثوم! تیری شب بیداریاں اور یہ لمبے لمبے کٹھن دن اب ختم ہوگئے" لیکن خود ہی کہتی "مجھ میں اور ان میں بڑا فرق ہے وہ تو بچپن کا زمانہ تھا جب انسان خواب کی طرح اصلیت سے کوسوں دُور ہوتا ہے۔ کہاں وہ زمیندار اور بستی بھر کے مالک اور کہاں میں بچاری؟" آج تمام دن اِسی الجھن میں گذرا۔ کبھی دل کہتا اتنے سال اس کی یاد میں گذارے ہیں، اب اس کے پاس جانے میں شرم کیسی؟ اور پھر اُس نے خود بھی تو کہا تھا کہ "تم ہمیں بہت یاد آؤ گی" لیکن جب قدم اُٹھتے تو خودداری زنجیر بنکر پاؤں میں پڑ جاتی۔ آخر انہیں ابتک کیوں نہ خیال آیا —— وہ خود ہی چلے آئیں گے"

چوکھٹ کے اوپر بیتے میں ایک دیا جل رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے تند جھونکوں سے اُس کی لَو لہرا جاتی تو اس کا ہاتھ خودبخود اس کے دل پر چلا جاتا۔ اللہ جانے آج یہ کیوں بے چین ہوا جاتا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ رات گئے تک اگر وہ نہ آئے تو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ اور اُنہیں سوتے سے جگا دوں گی۔ بس اسی خیال سے وہ ذرا نہائی دھوئی تھی۔ اُجلا رنگ تو یوں ہی تھا، صاف سُتھرے کپڑے پہن کر تو اور بھی اچھی نکل آئی۔ بال بھی سنورے ہوئے تھے۔ مگر جس پلنگ پر وہ بیٹھی تھی وہ کچھ اچھا نہیں تھا۔ اور پُرانا لحاف تو اور بھی بُری حالت میں تھا۔ اِس غضب کی سردی میں وہ خدا جانے کیسے گذارا کرتی تھی۔ لیکن یہ سوال تو امیروں کے لئے ہے، غریبوں کے ذہن کی پہانک

رسائی ہی نہیں ہوتی۔

اُسے سردی لگنے لگی تو اس نے لحاف ٹانگوں پر ڈال لیا۔ اتنے میں آواز آئی "کلثو!" وہ آواز پہچان گئی۔ عابد کی آواز کہیں تطویل زمانہ بھلا سکتا تھا؟ خوشی کے مارے وہ دیوانی ہو گئی۔ مگر پلنگ سے نہ اُٹھ سکی اور نہ اس کے منہ سے یہ نکل سکا "ہاں، میں اندر ہوں، آ جاؤ نا۔"

عابد نے جھانکا۔ اور خود ہی اندر آ گیا۔ وہ بُت بنی بیٹھی رہی۔ عابد نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ چہرے پر سے سمٹ سمٹ کر معدوم ہوئی جا رہی ہے۔ جیسے کوئی حسین گھڑا نہ خاک دفن ہو رہا ہو۔ وہ اُس کے پاس جلدی سے بیٹھ گیا "کلثو!"

کلثوم رو پڑی۔ نہ جانے اُس کا دل کیوں بھر آیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا "میں آپ کا کئی دن سے انتظار کر رہی تھی۔ میں سمجھی شاید آپ نہ آئیں ——— مگر میرے دل نے...... میرے دل نے کہا آپ ضرور آئیں گے۔"

"کیوں نہ آتا کلثو! میں نے تو تمہیں کئی بار یاد کیا۔ بھلا تم نے کیوں کیا ہو گا؟"

"آپ کو کیا معلوم ———" وہ اپنی بڑی بڑی پُرنم آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اماں کے مرنے کے بعد بس آپ کو یاد کر کے جیتی رہی ورنہ میں تو اب تک ———"

"تو ہم اکیلے رہ جاتے۔ کیا تم ہمیں اکیلا چھوڑ جاتیں؟" عابد کی طرح کلثوم نے بھی اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ مگر دفعتاً وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔ آج اسے شرم آ رہی تھی۔ جوانی کا بوجھ اُسے بے تکلف نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور جب عابد نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اس کا تنفس تیز ہو گیا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں باوجود کوشش کے حرکت نہ کر سکے۔ عابد نے اُس کے رخسار پر اپنے لب رکھ دیے اور شکستہ آواز میں کہنے لگا "تم کتنی خوبصورت ہو۔ کلثو!"

کلثوم کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا اور وہ اُس کی آغوش سے بچ نکلنے کی سعی کرتے ہوئے بولی "آپ ——— آپ یہ کیا کر رہے ہیں ......؟"

عابد انجان بنکر کہنے لگا "اور تم مجھ سے شادی کب کروگی؟"

"شادی؟" کلثوم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا "آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ میں تو غریب ہوں" اُس کی آنکھوں میں خوشی اور بے بسی کے آنسو جھلک آئے۔

"آپ ...... سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں بہت جلد!" وہ آگے ہی بڑھتا ہوا بولا "پھر ہم دونوں اس سامنے والے مکان میں آرام سے رہا کریں گے۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے کلثو"

(۲)

دو تین مہینے یونہی نکل گئے۔ آخر جب کلثوم کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تو عابد کو ہوش آیا۔ کلثوم میں سستی اور پھر اضمحلال دیکھ کر بعض عورتیں کچھ تاڑ گئیں۔ عورتوں کے ذریعہ یہ بات مردوں کے کانوں تک پہونچی اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف لوگوں کی اُنگلیاں اُٹھنے لگیں۔ قدرت بھی تو سماج کی طرح عورت کی لغزشیں طشت از بام کردیتی ہے! جوں جوں دن گذرتے رہے اس کے ماں بننے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ایک رات اُسے اذیت محسوس ہوئی۔ مگر وہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ آپ ہی آپ اُسے سہا کی۔ اِسی حالت میں گذشتہ واقعات سطح ذہن پر اُبھر آئے۔ اور اُسے وہ وقت یاد آیا جب عابد نے پہلی بار اس کے دل و دماغ پر ایک نامعلوم کیفیت طاری کردی تھی۔ اس خیالی تلذذ سے کچھ دیر کے لئے وہ جسمانی تکلیف کو بھول گئی اور سوچنے لگی اے کاش میں اس دن کے بعد زندہ نہیں رہتی اور یا وہ کیفیت ایک سلسلۂ لامتناہی ہو جاتا۔

"بس اب ایک یہی صورت ہے" عابد نے التجا کرتے ہوئے کہا "باہر گاڑی کھڑی

ہے۔ تم اس میں سوار ہو جاؤ۔ میں اُس گاؤں میں گھر دیکھ آیا ہوں۔ وہاں کوئی پوچھے تو کہہ دینا میرے خاوند شہر میں کام کرتے ہیں۔ کوئی ڈرنے کی بات نہیں۔ یہ بوڑھا گاڑیبان نیک آدمی ہے اور مکان بھی جانتا ہے۔ آرام سے لے جائیگا۔"

کلثوم منہ بند، اُسے چُپ چاپ دیکھتی رہی مگر اس کی خاموش آنکھیں کہہ رہی تھیں "آپ تو کہتے تھے ہماری بہت جلد شادی ہو جائے گی۔ اب وعدہ پورا کیوں نہیں کرتے؟"

عابد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔ "بڑا خراب زمانہ ہے کلثو! لوگ خواہ مخواہ ہمیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ذرا میں گھر والوں کو راضی کر لوں پھر میں تم کو جلد یہیں لے آؤں گا......... ہاں تم کسی قسم کا فکر نہ کرنا۔ ہر مہینے تمہیں خرچ چلانے کے لئے روپے بھیجتا رہا کروں گا۔ آؤ، اُٹھو، اُٹھو........"

اُس کا دل صاف تھا۔ عابد کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی اس کے خیال میں کوئی وجہ نہیں تھی۔ شام کی تاریکی اور تنہائی میں وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور بیل ڈگمگ ڈگمگ چلنے لگے۔ عابد کچھ دیر درختوں کی آڑ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کلثوم کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کے گھنے درخت اُس کے دل کی کہانی سُن سُنکر آہِ سرد بھر رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑی بان کے چمکارنے، یا کسی فاقہ زدہ کُتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیجاتی تھی۔ جو آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر اپنے پیدا کرنے والے سے جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، اپنی بیچارگی کی شکایت کر رہا تھا۔

(۴)

چار پانچ مہینے تک دس روپے آتے رہے جس سے اُس کی تن پروری تو ہو جاتی تھی مگر من کا روگ اُسے ایسا لگا تھا کہ اس کی جان گھُلتی ہی چلی گئی۔ ادھر پچھلے مہینے روپے

نہیں آئے اور عابد نے تو کبھی شکل بھی نہیں دکھائی۔ اس لیے اُس کا ماتھا ٹھنکنا تعجب خیز نہیں تھا۔ پڑوس میں ایک رحمدل بوڑھی عورت رہتی تھی اُس سے اُسے بہت کچھ سہارا تھا۔ ایک دن کلثوم سے اُس نے کہا "بیٹی! میری تو کوئی اولاد ہوئی نہیں۔ تیرے ہاں بچّہ ہوگا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی"

"بچّے" کا خیال آتے ہی کلثوم کانپ اٹھی "اماں! میں کہیں مر نہ جاؤں! ــــ مجھے اس وقت بڑی تکلیف ہو رہی ہے" پھر اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "اچھی مجھے اپنی گاڑی میں جلدی آسوَن پہونچادو ــــ وہ میرا گاؤں ہے"

بڈھا گاڑی ہانک رہا تھا اور کلثوم بے حال پڑی ہوئی تھی۔ خیالات اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے "کہیں وہ مجھے بھول تو نہیں گئے؟...... نہیں، نہیں ...... اور اگر بھول بھی گئے ہیں تو مجھے دیکھ کر اُنہیں رحم آجائے گا، پھر وہ کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے"

گاڑی جب زمیندار کے مکان سے ذرا ہی فاصلہ پر رہ گئی تو شور و غل کی آوازوں نے اُسے چونکا دیا۔

لوگ اپلے گیلے پھر رہے تھے۔ گاڑی کو راستہ بھی تو نہیں ملتا تھا۔ گاڑیبان کے پوچھنے پر کسی نے کہا "کیوں رے بڈھے تیری عقل سٹیا تو نہیں گئی؟"

دوسرا بولا "ارے بابا۔ تجھے نہیں معلوم کہ زمیندار جی شادی کر کے آرہے ہیں"

کلثوم تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے دیکھا کہ عابد کا مکان دُلہن کی طرح سج رہا ہے اُس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بوڑھے کے سنبھالتے سنبھالتے چکرا کر گر پڑی۔

اُمید کے آسمان پر ایک ستارہ جھلملا رہا تھا، آہ! آج وہ بھی غروب ہوگیا۔

آلامِ حیات

باہر برگد کے ایک پُرانے درخت پر اُس کا رفیق تنہائی حسبِ معمول مغموم و ملول بیٹھا اپنی آہ نیم شبی سے کسی کی موت کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔

اندر کے کمرے میں خاموشی اور اُداسی چھائی تھی۔ سِل کا مریض چارپائی پر بے حال پڑا تکلیفوں کے لامتناہی سلسلے سے نجات پانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کی زندگی کے قفس کی دو چار ہی تیلیاں ثابت رہ گئی تھیں۔ کوئی دم میں ایک ایک کرکے وہ سب بھی ٹوٹ جائیں گی۔ اور طائرِ روح آزاد ہو جائیگا پھر دکھوں کے انبار اور بے روزگاری کے غم اس کے پاؤں میں بے بسی کی بیڑیاں نہ پہنا سکیں گے۔ پاس ہی پٹی سے لگی اسکی نوعمر بیوی سرنگوں بیٹھی تھی۔ اُس کے دِل میں رہ رہ کر پریشان خیال آرہے تھے "ایسا نہ ہو کہ یہ زندگی کا جُوا ہار بیٹھیں!"

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اُس نے شعلے کی لَو لہرا دی۔ صَبیحہ نے اوپر نگاہ

اٹھائی اور آنسوؤں کے تاروں میں سے دیکھا کہ سامنے زندگی کے سمندر میں مریض کی کشتی موت کی موجوں سے گھر گئی ہے۔ اور وہ تھکے ہوئے ہاتھوں سے اس طرح پتوار چلا رہا ہے۔ جیسے کشتی کنارے آ لگی ہو۔ وہ چونک سی پڑی۔

مریض نے آنکھیں کھولدیں اور نحیف آواز میں بولا۔ "صبیحہ! رو کیوں رہی ہو؟"

صبیحہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ البتہ آنسوؤں کا سیلاب اسقدر اُمنڈ آیا گویا وہ اُس کی آنکھوں کو بصارت سے محروم کر دیگا۔

مریض سنبھالا لے رہا تھا۔ کمزور جسم کی گم شدہ طاقت پھر سے عود کر آئی۔ شاید یہ سمجھ کر کہ بے چاری موت کا مقابلہ کرے گی۔

اُس نے سرگوشی میں کہا "تم جانتی ہو کہ زندگی کا مقررہ وقت پر ختم ہو جانا ضروری ہے۔ لاکھ جتن کرو مگر روح کسی کے روکے نہیں رکتی!"

صبیحہ ذرا حیرت سے سُنتی رہی۔ آخر اس وقت یہ حکیمانہ نصیحت کیوں کر رہے ہیں!

مریض نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر کہا۔ "دیکھو ہم دونوں میں کتنا فرق ہے۔ تم میرے مرنے کے خیال سے رنجیدہ ہو۔ مگر مجھے خوشی ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کب تک خون تھوکتا رہوں؟۔ آہ! بیگم، میں تو گھل گیا ہوں۔ مجھ میں اب ڈھانچ کے سوا کچھ نہیں رہا اب تو تکلیف برداشت نہیں ہوتی .... میں مسلمان ہوں پیاری، بھلا مرنے سے کیوں ڈروں؟"

صبیحہ نے اُس کے سوکھے ہوئے ہاتھ پر اپنا رخسار رکھدیا اور مستقبل کے جھروکے سے ایک وحشتناک دُھندلکا دیکھ کر کانپ اُٹھی۔

"ہائے تیری جوانی خاک میں مل رہی ہے" مریض نے دُکھ بھرے لہجہ میں کہا "کاش میں تجھ سے شادی نہ کرتا" پھر وہ ذرا ٹھہر کر کہنے لگا "صبیحہ! ایک بات کہتا ہوں ...... میرے بعد تم دوسری شادی کر لینا"

کھوہ میں گھُسا ہوا اُلّو یکبارگی سیٹی بجاتا ہوا اُڑا اور فرشتۂ اجل کے پروں کی ہیبتناک پھڑپھڑاہٹ سُنکر مریض نے دنیا سے منہ موڑلیا۔ اُس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں۔ اور جسم محسوسات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔ صبیحہ ڈرگئی اور اس نے گھبراکر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا...... مردہ دانت نکوسے اس کو گھور رہا تھا۔ گویا حیاتِ مستعار کا مذاق اُڑا رہا ہے!

(۲)

والدین کے صرف دو ہی بچّے تھے۔ ایک یہ صبیحہ اور دوسرا سلیمان۔ سلیمان اُس سے ڈیڑھ دو سال بڑا تھا۔ مگر بچپن ہی سے وہ اُس پر حکمرانی کرتا آیا تھا، جیسے مسلمانوں کے ہاں عام طور پر بھائی اپنی بہنوں کو لونڈیاں تصور کرتے ہیں۔ لیکن اُن دونوں میں محبت بھی بہت تھی۔

کچھ دنوں کے اُلٹ پھیر میں ماں باپ نے ———— جیساکہ دنیا کا دستور ہے ———— گوشۂ تنہائی جا بسایا۔ اور روزِ جزا و سزا کے منتظر آرام سے سو گئے۔ بعد میں سلیمان نے حتی المقدور اپنی بہن کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن قسمت کے ہاتھوں ہر انسان مجبور ہوجاتا ہے۔ بہن کو اس سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ مگر مستقبل کی ناکامیوں کے آگے سب عاجز ہیں۔ چند ذاتی اغراض کی بنا پر سلیمان نے صبیحہ کی شادی ایک دائم المرض ادھیڑ عمر کے آدمی سے کردی۔ وہ بیچاری کیا بولتی دم گھونٹ کر رہ گئی۔ اُس کا عم زاد بھائی اکرم بھی کچھ نہ کرسکا۔ جسے وہ بچپن سے چاہتی تھی۔ اُن دونوں نے کم عمری میں اکثر دولھا دُلہن کا کھیل کھیلا تھا۔ لیکن وہ یہ کبھی نہ سمجھ سکے تھے کہ خواب کی تعبیر اُلٹی بھی ہوتی ہے۔ صبیحہ کا دل ٹوٹ گیا۔ جیسے کوئی معصوم یتیم بسیری کپڑوں میں اپنے ہم عمروں کو عید کی صبح قیمتی لباسوں میں اِٹھلاتے پھرتے دیکھے اور کوئی اس بیچارے کو جھڑک کر کہدے "چل یہاں سے! اس وقت کیوں آیا ہے؟"

کیا تیرے اماں، ابا، نہیں ہیں جو تجھے کپڑے پہنائیں!" اور وہ بے کس رو رو کر کہنے کی کوشش کرے " بابو! اُنہیں اللہ میاں نے بلا لیا ہے"

شادی کی خبر سنکر اکرم گم سُم سا ہو گیا۔ جیسے کوئی کسی بے گناہ مجرم سے، جبکے بیوی بچے اس کے سامنے بلک رہے ہوں، یہ کہدے " تم کو کل پھانسی ملے گی" اب کیا ہو؟ وہ ہاتھ ملتا رہ گیا!۔

بہنوئی کی موت کے بعد سلیمان بہن کو اپنے ہاں لے آیا۔ بڑے کمرے میں میاں بیوی رہتے تھے۔ اور بغلی کمرے میں سامان رکھا تھا۔ اس لئے صحن کے دوسری طرف ایک کوٹھری صبیحہ کو دیدی گئی۔ وقت کی ندی اپنی روانی سے بہا کی اور بیوگی کا روح فرسا خیال آہستہ آہستہ "مدھم ہوتا گیا۔ البتہ اکرم سے جو اَب ملنا جلنا ہوتا رہتا تھا وہ صبیحہ کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوا۔ جوانی کے جذبات جو شادی کے بعد سو چلے تھے پھر نئے سرے سے انگڑائی لیکر بیدار ہو گئے۔ ضمیر اور شباب میں مستقل جنگ رہنے لگی اور آخر کار اُسکی حالت اُس زخم کی سی ہو گئی جس کے نیچے فاسد مادہ پک ہا ہو نفس تحت الشعور میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ جس کو تسکین دینے کے لئے ڈاکٹر نے یہی تجویز کیا کہ صبیحہ کی دوسری شادی جلد سے جلد کر دی جائے۔ ورنہ ہسٹریا کے دورے اُس کی جان لیکر چھوڑیں گے۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ڈاکٹر؟" سلیمان نے حیرت اور غصے میں اپنے دوست سے کہا۔ "کیا اس کی دوسری شادی کر کے ہم اپنی ناک کٹوائیں گے؟"

"تم جانو!" ڈاکٹر نے ذرا ترشروئی سے جواب دیا۔ "میری رائے میں تو انکی جان بچانے کی یہی ایک صورت ہے...... بلکہ مجھے شبہ ہے کہ ان میں سِل کے جراثیم بھی ہیں۔ اِس لئے اور بھی میری تجویز پہ جلد عمل کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ممکن ہے......"

وہ بات کاٹ کر بولا۔۔۔۔۔"تم یہ چاہتے ہو کہ ہم خاندانی روایات کو ٹھکرا دیں؟"

"معاف کرنا سلیمان!" ڈاکٹر جلتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارے خیالات نہایت افسوسناک ہیں۔ بالکل جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ آخر نکاح ثانی حرام تو نہیں ہے؟"

(۳)

صبیحہ نے کروٹ بدلی اور دیکھا کہ اکرم سامنے بیٹھا ہے۔ اُس کے چہرے پر رونق سی آگئی اور وہ آہستہ سے بولی "کب سے بیٹھے ہو؟"

"ابھی آیا ہوں" اُس نے افسردہ آواز میں کہا۔ "بھابی نے بتایا کہ تم بہت دیر سے غافل پڑی ہو"

صبیحہ اُسے خاموش نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کے جسم کا رواں رواں پکار رہا تھا۔ "آؤ۔ مجھے آغوش میں لے لو۔ کیا خبر کل یہ جسم آشنائے محبت ہوئے بغیر ہی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو جائے" لیکن وہ خود کچھ نہ کہہ سکی۔ حواس اور جذبات بر سرِ پیکار تھے۔ ایکا ایکی غیر ارادی طور پر صبیحہ نے اکرم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو اپنے کمزور ہاتھ میں تھام لیا۔ کچھ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے سا لگا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔

رات آج خلاف معمول سرد تھی۔ طوفانِ باد و باراں کے ڈر سے نڈر پنکھ پکھیرو بھی کہیں کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے۔ ہیبتناک بادل گھر گھر کر پورب اور پچھم سے آ رہے تھے۔ اور جب وہ پوری قوت سے نبرد آزمائی کرتے تو اُن کے دہن سے شرارے برسنے لگتے۔ پچھلے پہر فضا پر سکون ہوئی تو سلیمان ناگہانی بارش کے آجانے پر جز بز ہوتا ہوا اندر داخل ہوا۔ جب تک اُس نے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر خشک لباس پہنا، بیوی نے رازدارانہ طور پر اس سے بہت کچھ باتیں کہہ دیں۔ وہ دنگ

رہ گیا اور درشتی سے کہنے لگا "کیا اسوقت تک وہ صبیحہ کے پاس ہے ؟"

"ہاں" -

"ابھی تو میں زندہ ہوں" سُلیمان گرجتا ہوا بولا "میرے جیتے جی کوئی بے حیائی نہیں ہو سکتی"

اُسے غصّے سے کانپتے دیکھ کر بیوی نے منّت سے کہا "ابھی میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ ان دونوں کی شادی کر دو"

"چپ ہو جاؤ" وہ خشمناک ہو کر بولا "میں آج ہی اُس کا منہ کالا کئے دیتا ہوں۔ میری طرف سے تو وہ مر چکی۔ جو اُس کا دل چاہے کرے۔ .... اور اکرم اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ اُسے ہمارے ناموس کا کچھ بھی خیال نہیں رہا"

سلیمان تیزی سے صبیحہ کی کوٹھری کی طرف لپکا۔ گویا وہ اُن دونوں کو جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں میں جلا کر خاکستر کر دیگا۔

"نہیں بھائی۔ اب خفا مت ہو" اکرم بھرائی ہوئی آواز میں بولا "صبیحہ تو اب ختم ہو چکی ہے"

سلیمان کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کے دل پر گھونسہ مارا ہے۔ ایک لمحے کے لئے وہ سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ پھر آپ ہی آپ آہستہ آہستہ وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ اور دیکھا کہ جس مظلوم کو وہ راتوں رات گھر سے نکالنے آیا تھا اب اسکی نعش اُس کے سامنے بے بس پڑی ہے۔ نفس تحت الشعور نے بچپن کی باتیں ایک ایک کر کے سطح ذہن پر ابھار دیں۔ ایک دفعہ سلیمان کو بھوک کے مارے روتا دیکھ کر صبیحہ خود بھوکی رہی اور اپنا کھانا اُسے دیکر کہا "تم کھاؤ میں کھا چکی ہوں" اور جب سردیوں میں ایک رات وہ بُری طرح اکڑ رہا تھا تو بہن نے اپنی دُلائی اُسے اُڑھا دی۔ جوں جوں گذرے ہوئے واقعات اُسے یاد آتے رہے اُس کا ضمیر اُسے کچوکے دیتا رہا۔

اُس نے پھر ایکبار لاش کیطرف دیکھا......... بیوی نند کی آخری خدمت انجام دے رہی تھی...... پاؤں کے انگوٹھے بندھے ہوئے!۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں کے ساتھ!۔ ڈھاٹا بندھا ہوا۔ گردن ایک طرف جھکی ہوئی، زرد چہرہ، بے نور آنکھیں، بال بکھرے ہوئے، جلد ہڈیوں سے چمٹی ہوئی......... آہ! جوانی اور حسن کی کیسی دل ہلا دینے والی موت!۔ رُکے ہوئے چشمے ایک بار ہی پھوٹ پڑے۔ آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا اور وہ دہاڑیں مار کر رونے لگا "اے میری بہن! یہ تو نے کیا کیا؟ کیا تیری روح میرے ڈر سے اپنا جسم چھوڑ کر چلی گئی؟...... اچھی صبیحہ تیرا بھائی تیرے قدموں میں سر رکھے دیتا ہے"

اکرم نے سلیمان کا سر پٹّی پر سے اُٹھایا اور بیوی نے آگے بڑھکر اُسے کلام پاک دیا۔ "اب رونے سے کیا فائدہ؟ لو اسے پڑھو۔ تاکہ اُن کی روح کو سکون ہو"

جیسے کوئی زیرِ سحر عامل کا کہا مانے، اس نے کتاب مقدس کھولی۔ لکھا تھا:۔

"اور اگر کوئی دکھیاری بیوہ ہو جائے تو اُس بیچاری کا دوسرا بیاہ کر دو!"

...... آسمان کے ایک کونے میں صبح کا ستارہ چپکے چپکے رو رہا تھا۔

سنہ ۱۹۳۶ء

شعلۂ سوزاں

پروین کے ناسمجھ دل میں عمر کے ساتھ ساتھ یہ آرزو بھی جوان ہو رہی تھی کہ وہ اور مسعود جلد از جلد رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔

وہ اُس کا ماموں زاد بھائی تھا، نوجوان اور ہنس مکھ۔ وہ غریب گھرانے کی لڑکی تھی، شوخ اور حسین۔ وہ دونوں بچپن کے ساتھی تھے اور اُنہوں نے نہر کے کنارے ریت کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا کر اکثر میاں بیوی کا سوانگ بھرا تھا۔ پروین محبت کے معصوم گہوارے میں پل رہی تھی۔ ایک ایسے گہوارے میں جس کی طرف عورت فطرتاً مائل ہوتی ہے۔ اور مسعود کی محبت ایک ایسے خمیر سے تیار ہو رہی تھی جو جوانی کے نشے میں مخمور اکثر مردوں کا خاصّہ ہوتا ہے۔ آغاز شباب سے پہلے چاندنی راتوں میں اُن دونوں کی ملاقاتیں اس طرح پر اسرار ہوتی تھیں گویا دو پاکباز روحیں کسی فردوسی درخت کے سایہ تلے سرگوشی میں

مصروف ہیں اور یہ معصوم سرگوشیاں آہستہ آہستہ ہمیشہ کے لئے لا متناہی محبت میں تبدیل ہو جائیں گی ——— مگر جوں جوں وقت گذر رہا تھا اُن دونوں کے راستے علیحدہ اور ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

تعلیم و تربیت نے پروین کو بے باک اور خودسر نہیں کیا، پڑھ لکھ کر بھی وہ دبی دبائی سی، الھڑ، اور وفا شعار رہی، لیکن کالج کی ہوا نے مسعود کے خیالات میں پر معصیت تبدیلی پیدا کر دی۔ اور یوں بھی وہ دولتمند والدین کا بیٹا تھا، بھلا امارت اُس کا دماغ خراب نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟ جب تک اُن کے والدین کی ایک سی حالت رہی وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب رہے مگر جب مسعود کے باپ نے مفلسی کے کھنڈر مسمار کر کے امارت کا بلند محل کھڑا کیا ان کی نسبت چھوٹ گئی۔ پھر دوستوں کی صحبت نے بچپن کی فریب وریا سے پاک باتیں بھلا دیں اور پروین کی بھولی بھالی صورت مسعود کے دل سے ایک مدھم نقش کی طرح مٹ گئی۔

کچھ اس لئے کہ اُن لوگوں میں جوان بیٹی کا نا کتخدا رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور کچھ اس خیال سے کہ مسعود سے نسبت چھُٹ جانے کا قلق جسقدر جلد ممکن ہو زائل ہو جائے۔ پروین کی شادی قاسم سے کر دی گئی۔ جو تعلیم یافتہ اور خوبصورت تھا۔ پروین کو اس سے مسرت ہوئی اور نہ رنج۔ مسرت اسلئے نہیں کہ وہ ایک دوسرے شخص کے ساتھ تمام عمر رہنا چاہتی تھی۔ اور رنج اسلئے نہیں کہ خود مسعود وعدۂ وفا ٹھکرا کر ایک اونچے گھرانے کی بیٹی بیاہ لایا تھا۔ قاسم سے شادی ہو جانے کے بعد بھی وہ قسمت کی ہیٹی رہی، کیونکہ اُس کے شوہر نے اُسے کبھی اپنی رفیق حیات نہ سمجھا، بس وہ آپسمیں اس طرح رہتے تھے جیسے کوئی دو مسافر راہ چلتے ایک دوسرے کو پہچان گئے ہوں کبھی کبھی تو قاسم اُس کے ساتھ غیروں کا سا سلوک کرتا، لیکن اسپر بھی وہ بیچاری

کبھی شاکی نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے، آخر تو وہ مسلمان کوک سے پیدا ہوئی تھی۔

(۲)

اُس شام قاسم خلافِ معمول سویرے سے گھر واپس آگیا۔ اس نے دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ اُس کی آنکھوں نے دیکھا ——— دیکھا کہ پروین کے پاس ایک نوعمر شخص بیٹھا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں شباب کی چمک اور بشرے سے کسی مکروہ عزم کی جھلک ہویدا ہے۔ وہ متحیر ہوا۔ اور اُس کے دل میں طیش کروٹیں لینے لگا۔ یکبارگی اس کی نظر پروین پڑی۔ وہ مجسم معصومیت اِس طرح سرنگوں تھی کہ بیکسی اور خلوص کا امتزاج اُس کے چہرے پر ایک خاموش تلاطم پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے سر اونچا کیا اور بولی ——— قاسم پردے کی آڑ میں چھپ گیا۔

"تم مجھے کہاں لے چلوگے؟"

"ہم کسی نامعلوم شہر میں چلے جائیں گے" نوجوان نے کہا "ایک ایسی جگہ جہاں عزیز و اقارب ہمارا کھوج نہ پاسکیں گے اور وہاں ...."

"اُف! ———" وہ بات کاٹ کر اس طرح بولی گویا اُسے کوئی روحانی تکلیف پہونچی ہے "تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ چلوں؟... ...... مسعود! یہ بات تمہاری زبان سے ادا کیسے ہوگئی؟"

"ادا کیسے نہ ہوتی؟" مسعود نے اپنا ہاتھ پروین کے ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "سماج نے ہم دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ حالانکہ ہم بچپن سے آپسمیں منسوب تھے۔"

"سماج کو کیوں بُرا کہتے ہو؟" پروین اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی "جب تم نے دوسری جگہ شادی کر لی تو کیا تمہاری یہ توقع تھی کہ میرے ماں باپ مجھے کنوارا

ہی رکھتے؟ ——— خیر چھوڑو ان باتوں کو! مجھے افسوس ہے میں تمہاری بات پہلے نہ سمجھ سکی، آہ! تم مجھے میرے شوہر سے چھڑانا چاہتے ہو؟"

"لیکن تمہیں اپنے شوہر سے محبت تو نہیں ہے" وہ بے باک ہو کر کہنے لگا اور وہ وحشی تم سے شوہروں کا سلوک بھی تو نہیں کرتا۔ تم اُسے ——— ؟"

"مسعود! ———" پروین چیخ کر کہنے لگی۔ گویا کسی نے اُس کی سخت توہین کی ہے۔ "تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اپنے جذبات کو آپے سے باہر نہ ہونے دو۔ میرا شوہر کیسا ہی سہی، یہ ہم دونوں کا معاملہ ہے، کسی اور کو اس پر رائے زنی کی ضرورت نہیں۔"

"کیا وہ رات رات بھر آوارگی کرتا نہیں پھرتا؟ اُس نے کبھی تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارے دل کی آواز بھی سُنی؟" مسعود نے تنفر آمیز لہجہ میں کہا۔

"تمہارے سوالات بے معنی ہیں" وہ نیچی نگاہ کیے کہتی رہی "وہ اکثر گھر سے باہر بھی تو نہیں نکلتے۔ اکثر اُن کی راتیں یہیں بسر ہوتی ہیں۔ رہیں میری باتیں، تو دل کی دھڑکن کے لئے گویائی ضروری نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ساز نغمہ پیدا کرے۔ اور فضا مرتعش نہ ہو۔ اب نہ سہی، پھر سہی، اُن کا قلب کبھی نہ کبھی متاثر ہو کر رہے گا ——— اور پھر میں تو ہر طرح خوش ہوں۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔"

"کہنے کا کیا ہے، چاہے جو کہہ لو" مسعود نے اُس سے بھڑ کر کہا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آہ سرد کھینچی .... "پروین! تم مجھے بچپن سے چاہتی ہو، آخر میرا کہا کیوں نہیں مان لیتیں؟"

پروین کے لبوں پر حسرت کھنڈ گئی۔ اور وہ ہولے ہولے کہنے لگی "مسعود! یہ سچ ہے کہ میں تمہیں چاہتی تھی۔ لیکن تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ اپنے عہد و پیمان کا

تمہیں پاس نہیں رہا۔ جوانی اور دولت نے تمہیں محبت کے صحیح معنے جاننے نہ دیئے تمہیں کیا معلوم، تمہاری شادی سے میرے دل پر کیا گذری۔ جب میں نے تمہیں خوش و خورم دیکھا تو مجھے اپنی ہستی ایک خزاں زدہ پودے کی مانند معلوم ہوئی جیسے کسی مالی نے بیکار سمجھ کر اکھاڑ پھینکا ہو۔ میں انسان تھی، میرا بھی دل تھا، بھلا بتاؤ تو، کیا اس ضرب سے وہ پاش پاش نہ ہوجاتا؟ میرے حواس ٹھکانے نہ رہ سکے مجھے ہر طرف ویرانی اور اُداسی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم میں کوئی دوسری بے قرار روح مقید کردی گئی ہے۔ تم آج وہ باتیں سننے آئے ہو جو مجھے چار سال پہلے سُنانی تھیں، مگر تم اپنی دلہن کی دلچسپیوں میں مصروف تھے، تمہیں میرے دل کی آواز سُننے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ سچ جانو میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم مجھ سے شادی نہ کروگے۔ تم ہی بتاؤ اگر یہ بات تمہارے ساتھ ہوتی تو کیا تم یہ صدمہ برداشت کرلیتے؟ لیکن میں نے کیا! ——— خدا نے، جو رحیم ہے، میرے لئے قاسم کو بھیجدیا۔ وہ میری زندگی کے رفیق ہیں۔ اور میں اُن کے ساتھ اب اپنے آپ کو ہر طرح مامون سمجھتی ہوں۔ تمہارا خیال ہے اُن کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں۔ ممکن ہے تمہاری نظروں میں ایسا ہی ہو، لیکن میرے لئے اُن کا یہی سلوک مناسب ہے۔ اُن کی بے رخی مجھے اور بھی اُن کی طرف کھینچنے پر مجبور کرتی ہے اب تو میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ شادی ہونے کے کچھ دن بعد تک مجھے جو تمہارا خیال رہا وہ بھی اُن کی بیوی ہوجانے پر نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ میں دل سے مجبور تھی! اس لئے اس کا کفارہ اِس طرح ادا کررہی ہوں ...... رہے تم تو مسعود میں، اب تمہاری صرف عزت کرتی ہوں ——— مجھے تعجب ہے تمہارے ضمیر نے تمہیں کیونکر اسقدر اخلاق سے گری ہوئی بات کہنے کی اجازت دیدی۔"

"پروین! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں ———" مسعود

تیز ہو کر بولا۔ "تم بہت مغرور ہو گئی ہو! لیکن یاد رکھنا کہ تم میرے بس میں ہو۔"

"کیا مطلب ہے؟" پروین نے حیرت سے کہا۔

مسعود طنزیہ ہنسا۔ "یہی کہ رات کی تنہائی میں تم مجھ سے اسقدر قریب ہو! تم اگر میرے ساتھ نہیں چلتیں تو میں یہیں بیٹھا ہوں، جب قاسم آئیگا تو میں اُس سے کہدوں گا کہ تم مجھ پر مائل ہو۔ معلوم ہے پھر کیا ہو گا؟ ظلم وستم میں اضافہ! شاید اُس وقت تم کو میری مدد کی ضرورت ہو۔"

"میں تم سے مدد کبھی نہیں مانگوں گی مسعود!" پروین اطمینان سے کہنے لگی۔ "تم چاہو تو یہ بھی کر دیکھو۔ میں اسے ترجیح دیتی ہوں۔ وہ میرے شوہر ہیں۔ آخر کب تک بدظن رہیں گے۔ اور یوں بھی دُکھ کی تو میں عادی سی ہو گئی ہوں۔"

پروین مسعود کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ پیچھے ہٹی۔ "تم اب چلے جاؤ مسعود! رات سرد ہے اور تمہارا راستہ دُور۔"

"نہیں۔ اب دور نہیں رہا۔" مسعود نے معنی خیز لہجہ میں کہا اور آگے بڑھنا چاہا کہ سامنے کے پردے کو جنبش ہوئی اور قاسم دفعتاً آگے بڑھ آیا۔

۳

"نہ رو پروین۔" قاسم نے اُسے پہلی بار محبت کے اُمنڈتے ہوئے طوفان میں سینے سے چمٹا کر کہا۔ "دیکھو —— وہ سامنے شیطان مسعود جا رہا ہے۔ اب وہ کبھی آکر تمہیں تنگ نہ کر سکے گا۔"

"قاسم!" وہ بمشکل کہہ سکی "میری زندگی اُس شمع کی مانند ہر وقت اپنی لاچاری پر آنسو بہاتی ہے جس کی لَو آندھی کے جھونکوں میں لہرا رہی ہو۔ ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل میں ایک چنگاری روشن ہے اور شادی کے بعد میں نے اُس چنگاری کو بجھا دینا چاہا۔ لیکن اس کے بعد، جس

چیز نے میری زندگی اجیرن بنادی وہ تمہاری محبت سے محرومی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھے حیاتِ نو بخش دوگے۔ مگر مجھے تو جنم بھر دہکتے ہوئے انگاروں پر پر لوٹنا تھا........"

"پروین! میری بات تو سُنو!" قاسم نے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم مجھے معاف کردو۔ تمہاری پاکیزگی نے آج میری آنکھوں کے پردے ہٹا دیئے ہیں۔ میرے ظلم ناروا نے تمہارے دل میں جو شعلۂ سوزاں پیدا کردیا تھا۔ آج اُسی نے میرے غیر شریفانہ جذبات کو جلا کر خاکستر کردیا ہے"

قاسم نے اُس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا، لیکن پروین نے اُس کے رُخساروں کو ہاتھوں میں لیکر اُس کا سر اوپر اٹھایا —— دونوں کی نظریں ملیں اور اُس لمحہ کتابِ زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

سنہ ۱۹۳۸ء

بے زبان

جیسے کم ظرفوں میں گھر داماد کا ہد ڑا برا ہو ویسے ہی اُس بے چارہ کی مٹی پلید تھی جب تک ہاتھ پیر چلتے رہے اُس وقت ہی اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی، معذور ہوئے پیچھے تو کون پوچھتا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو؟ دن بھر وہ غریب محنت مشقت کرتا پھر بھی مار پیٹ اور گالیاں کھانا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ بساط سے زیادہ بوجھ ڈھو کر وہ خون پسینہ ایک کر لیتا تب کہیں جا کر دھمیں ڈالنے کے لیئے کچھ ملتا، وہ بھی اس لیئے نہیں کہ یہ اُس کا حق تھا بلکہ محض اِس لیئے کہ اُس کی زندگی منظور تھی تاکہ کمائی کا ذریعہ قائم رہے۔ اپنی حق تلفی اور یہ مظلومی اسے عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہ بے زبان، اشرف المخلوقات کے آگے بالکل بے بس تھا۔ بھلا اُس میں اتنی ہمت کہاں سے آتی کہ وہ خدا کے خلیفہ سے اپنے حقوق زبردستی طلب کرتا اور کہتا "میں اپنی جان تمہارے لیئے ہلاک کیئے دیتا ہوں، خدارا میرے ساتھ وہ سلوک تو نہ کرو جو انسانیت

سوز ہے"۔ نہیں، نہیں، یہ گستاخی، یہ بے ادبی، یہ سرکشی، بارگاہ انسانیت میں ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔ پروردگار کے نائب کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے سے کمزور کو پیس ڈالے۔ اور اُس کے خون سے کاخ بلند کھڑے کرے۔

اُس کا ایک ساتھی تھا، روبی۔ دونوں بچپن سے اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ جب اُنہوں نے ہوش سنبھالا تو ایک نے دوسرے کو اپنا ہمدم پایا۔ ماں۔ باپ اور دوسرے عزیز و اقارب یا تھے نہیں یا لاپتہ تھے۔ نتیجہ معلوم! ہر متنفس سے بے نیاز ہو کر اُن دونوں کے پاک جذبات (یہ کیا کہا؟ اتنی جرأت؟ یہ بیباکی؟ خبردار! "پاک" کا لفظ تو صرف اولادِ آدم کے لئے مخصوص ہو چکا ہے، حیوانی جذبات کہو!) ایک دوسرے کے لئے وقف تھے۔ ایک کو دکھ ہوتا تو دوسرا اشاروں ہی کنایوں سے کہتا "بھائی غم نہ کرو، تمہارے دُکھ درد میں مَیں شریک ہوں"۔ اور پھر دونوں ٹکٹکی باندھ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے، یہانتک کہ حکم نازل ہو جاتا کہ "کام کا وقت آگیا، چلو اپنا فرض ادا کرو"۔ پھر وہی زندگی کی چکی شروع ہو جاتی، جس کے ہر چکر سے صرف ایک صدا "کام! کام!" کی نکلتی رہتی۔

جوانی بھر اُس کو اپنی محنت اور سخت کوشی کا خیال نہ آیا۔ ہاں جب زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈھونے پر بھی مالک کے یہ الفاظ سنتا "ارے یار! یہ کمبخت گدھا بڑا ہی بدجانور ہے، ہمیشہ مکر اپن کرتا ہے"۔ تو اُس کے دل پر چوٹ سی لگتی اور وہ چپ چاپ گردن لٹکائے منزلِ مقصود کی طرف چلنے لگتا۔ لیکن کہیں روبی مل جاتا اور وہ اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتا تو اس کے دل پر سے رنج کی سل اُتر جاتی اور وہ دونوں چند لمحات کے لئے سنگدل انسان کی سہما دینے والی ہیبت سے غافل ہو کر اخلاص و محبت سے محظوظ ہونے لگتے۔ کبھی کبھی راستے میں لمبی لمبی ستھری گھانس اور رئیسی گھوڑوں کا مزیدار چارہ دیکھکر اُس کے منہ میں پانی بھر آتا۔

لیکن یہ چیزیں اُسے بھلا کہاں نصیب ہو سکتی تھیں۔ ایک رات اُس نے خواب دیکھا کہ وہ کسی بڑے رئیس کے اصطبل میں رہتا ہے اور صرف کبھی کبھار، گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیئے اُس کی ہلکی پھلکی، رنگ برنگی فٹن میں جُت جاتا ہے۔ دیکھو نا وہ ایک آدمی آیا، کیسی محبت سے اُس کی گردن پر پیار کرتا ہے۔ کمر پہ ہاتھ پھیرتا ہے اور پٹھے پر تھپکی دیتا ہے۔ پھر اُس نے اُسے خوبصورت ساز پہنایا اور بڑی ملائمت سے گاڑی میں جوت دیا۔ تھوڑی دیر میں میلے کچیلے اور تعفّن آمیز کپڑوں میں نہیں۔ بلکہ نہایت شاندار لباس میں رئیس صاحب آگئے۔ اور اُنہوں نے چمکار کر چلنے کا اشارہ کیا "ہاں بیٹا" اب نہ وہ روز روز کی کِل کِل ہے اور نہ پٹ پٹ، نہ وہ بوچھوں مرنا ہے اور نہ وہ حقارت آمیز سلوک۔ تھوڑی دیر کی ہوا خوری کے بعد نیلو واپس آگیا۔ بڑی شاباشی دی گئی، خود رئیس بہادر نے بھی پیار کر کے ہمّت بڑھائی۔ پھر طرح طرح کا چارہ آگے رکھا گیا، گڑ اور چنے کی سانی دی گئی اور سونے کے لیئے نرم نرم گھاس کا بچھونا بچھوا دیا گیا۔ مگر........ صبح ہونے لگی تھی۔ روبی اپنے دوست کے چہرے پر مسکراہٹ (جو انسان کے لیئے غیر مرئی ہے) دیکھ کر حیرت سے بھونکنے لگا۔ اور نیلو ایکا ایکی کمر پر ایک موٹا سا ڈنڈا پڑ جانے سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اُس کی نیند نہیں بھری تھی اور مار کی تکلیف کو بھول کر وہ خواب کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کپڑوں کے بڑے بڑے گٹھر اُس پر لاد دیئے گئے اور ساتھ ہی گالیاں اور جھینکنا سنائی دیا "لے یہ ڈنڈا لے، ذرا زور سے مار دو، یہ بدذات بغیر اڑے چلتا ہی نہیں"

ایک بات روبی کی سمجھ میں کبھی نہ آسکی۔ اُس نے برسات اور خزاں کی دسیوں صبح و شام دیکھی تھیں۔ لیکن چاہے چاروں طرف ہریاول ہی ہریاول ہو، یا تا حدِّ نظر تمازتِ آفتاب سے جھلسا ہوا چٹیل میدان، نیلو بدنصیب ہمیشہ بھوکا رہتا۔ وجہ یہ تھی کہ اُسے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ ہری ہری برسات میں کچھ بھی

متمتع ہوتا۔ گویا برشگال کے موسم میں بھی جبکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ حیاتِ تازہ حاصل کرتا ہے اُس بیچارے کی قسمت قدرت کی تقسیم سے محروم ہی رہتی۔

ایک روز شیشم کے سائے تلے روبی سرنگوں بیٹھا ہوا اپنے رفیق دیرینہ کی ازلی بدنصیبی پر غور کر رہا تھا کہ اُس نے کسی کی آہٹ سُنی۔ روبی کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اِس لئے اُسے دور کی چیز اچھی طرح نہ سُجھائی دی۔ جب وہ آواز اور بھی قریب آگئی تب اُس کی دھندلی نظر نے دیکھا کہ بوڑھا نیلو ہولے ہولے چلا آتا ہے۔ روبی اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اسکے اسے دیکھ کر انگڑائی نہ لے سکا۔ دونوں بوڑھے ہو چکے تھے اور اُن میں اب جان باقی نہ رہی تھی۔ نیلو نے جب بصد مُشکل اُس کی کمر پر آہستہ آہستہ اپنا کھُر پھیرا تو روبی یہ دیکھ کر گم سم سا ہو گیا کہ نیلو کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے اور اُس کی کمر سے جیتا جیتا خون بہ رہا ہے۔ مگر وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس کی طرح اسے بھی اس کے مالک نے چلتے چلتے تمام عُمر کی خدمت اور وفاداری کا یہ صلہ دیکر رخصت کیا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُسے خود اپنی زدہ حالت بھی یاد آگئی۔ وہ نہ اب گھر کا تھا اور نہ گھاٹ کا۔ کئی دنوں سے وہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ نہ اُسے روٹی کا ٹکڑا میسّر تھا نہ پانی کا قطرہ۔ پھر بھی اپنی اُفتاد کو بھُول کر (اور وہ کوئی انسان تو تھا نہیں جو اپنا دکھڑا لے بیٹھتا) وہ نیلو کو دکھ بھری نظروں سے تکنے لگا اور جب اُس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں تو نیلو، روبی کے دیکھتے دیکھتے ہی زمین پر گر پڑا۔ اُس کی کمزور ٹانگیں اس کا جسم سہار نہ سکیں، بس اُس میں اتنی سی سکت باقی رہ گئی تھی کہ اُس کے منہ سے ایک فلک شگاف آہ نکلی اور پھر بدن کی کھال پارہ سیماب کی طرح لگاتار تھر تھر کانپنے لگی۔

روبی یہ کیفیت دیکھکر اُس کے بالکل پاس سرک آیا اور اس کی زخمی آنکھ کو اپنی زبان سے چاٹنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی جسمانی اور روحانی تکالیف کا

اُسے اچھی طرح احساس ہے۔ اسی لئے اُس کا دکھ ذرا ہلکا کرنے کو اُس نے اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔

نیلو بھیّا! تمہاری طرح میں نے بھی اپنے مالک کی بڑی خدمت کی تھی۔ دن دن بھر پاسبانی کی، راتوں کو جاگ جاگ کر اُس کے گھر میں چوروں کو پکڑوایا ——— ایک دفعہ تو اُس کے لڑکے کی جان بھی بچائی۔ مگر اس سب کا عوض مجھے یہ ملا کہ اب جبکہ مجھ میں ہلنے کی بھی طاقت نہیں رہی، اُس نے مجھے لکڑیاں مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ میں رویا، قدموں پر لوٹا، تلووں کو چاٹا مگر اس نے ایک نہ مانی ——— خیر، چلو اچھا ہوا ہم دونوں کو اِنکی بیدردی اور بے رحمی سے نجات تو مل گئی۔ اب ہم انسانوں کی بستی میں زیادہ ظلم اور بے انصافی نہیں سہیں گے!"

روبی کی کتھا کا آخری باب سُنکر نیلو نے ذرا اپنی گردن کو جنبش دی اور اُس کے منہ سے اپنا مُنہ ملا دیا۔ روبی بھی اُس سے بھڑ گیا، اور اپنے پرانے اور سچے دوست کی آغوش میں بیٹھکر فرطِ محبت سے دُم ہلانے لگا

سنہ ۱۹۳۶ء

جیون ایک پہیلی

قصہ مختصر، انٹرنس میں نہایت عمدہ نمبروں سے فیل ہوئے - آپ کہیں گے -
"کند ذہن تھے" میں کہتا ہوں کہ بیوی سے لڑ کر یا جلی طبیعت سے پرچے دیکھئے تو فیل
کرنے کے سوا آپ کو توفیق ہی کیا ہو گی ؟ فیل ہونے کے بعد اسکول کے ساتھ گھر بھی
چھوڑنا پڑا - کیونکہ ابّا صاحب دوسری شادی رچا بیٹھے - بھلا سوتیلی ماں یہ کیوں پسند
کرتی کہ سوت کی اولاد اُس کے سامنے پروان چڑھے ، چنانچہ جب گھر سے نکال دیئے گئے
تو روٹی کا فکر ہوا ، مگر روٹی ملتی کہاں سے ؟-

چار پانچ روز تک یوں ہی اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا رہا - مگر نوکری کی کوئی
صورت نظر نہ آئی - جو چند پیسے بچ رہے تھے وہ بھی ایک ایک کر کے خرچ ہو گئے - تین وقت سے
کھیل کا دانہ تک اُڑ کر منہ میں نہیں گیا اور شکل پر بارہ بجنے لگے -
بھیک مانگتے ہوئے شرم آتی تھی - اس لئے یہ سوچ کر کہ اپنے دیس سے دور کسی

دوسری جگہ کچھ نہ کچھ مل جائیگا ایک طرف چل کھڑا ہوا، شہر چھوڑے کئی گھنٹے ہو گئے، اور پیٹ پیٹھ سے آلگا، مگر میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے ہی بڑھتا رہا۔ چند اور گھنٹے گذر گئے، یہاں تک کہ شام کے جھٹ پٹے میں دانہ دُنکا چُگ چُگا کر ہریل اور کوّے رین بسیرا کرنے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے۔ لیکن مجھے پیٹ بھرنے کی اب بھی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کبھی کبھی زندگی کی آس ٹوٹ جاتی تو سوچتا "موت کو یوں ہی آنا ہے تو آچکے، کم از کم بھوک سے تو چھوٹ جائیں گے......"

آکاش پر چندرمان براجمان ہو چکے تھے اور ہلکی ہلکی چاندنی میں چاروں طرف کی چیزیں مدھم سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ چند گز کے فاصلے پر، مٹی کی اونچی مینڈھ سے گھرا ہوا ایک کھیت تھا اور مکئی اور باجرے کی فصل تیار کھڑی تھی۔ طبیعت لہرا گئی۔ لپک کر میں مینڈھ پر چڑھا۔ مگر دھوتی کانٹوں میں اُلجھ گئی، بڑی مشکل سے اُس سے چھٹکارا پاکر چپکے چپکے دو چار بھٹے توڑے اور ادھر اُدھر سے کچھ پھپھیاں جمع کر کے آگ جلائی۔

تھوڑی دیر ہوئی ہوگی کہ آواز آئی "کون ہے رے؟ کا کرت ہے؟"

روح فنا ہو گئی "مسافر ہوں بھیّا" میں نے بیچارگی سے کہا "بھٹے بھون رہا ہوں"

"کھریدے ہیں کا؟" ایک تگڑے سے جوان نے میرے قریب آکر پوچھا۔

"خریدتا کہاں سے؟" میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا "بھوکا ہوں بھائی۔ کئی وقتوں کا فاقہ ہے"

"تو چوری کی ہے؟ سرم نہ آئی؟" وہ مجھے ذرا حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا کروں" میں نے عاجزی سے کہا "بھوک کے مارے مرا جا رہا ہوں۔ ورنہ چوری کبھی نہیں کرتا"

"بڑے افسوس کی بات ہے" کہہ کر وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھے غور سے

دیکھ کر کہنے لگا "سکل سے تو سریف معلوم ہوتے ہو! بھوکے کا ہے کو ہو؟"

"اس زمانے میں تو شریف ہی بھوکے رہتے ہیں" میں نے کہا "تو کیا میں تمہارے بھٹے کھالوں؟"

وہ میری بات نہ سمجھ سکا اور نرم لہجہ میں بولا۔ "یہ اپنے نا ہیں ہیں، میں تو ادھر سے جا رہا تھا۔ پر تم کہاں رہت ہو؟"

میں نے اپنی رام کہانی سنائی تو وہ بڑا ملول ہوا اور دھیرے سے کہنے لگا۔ "تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں سے تھوڑی دور میری جھونپڑی ہے، وہاں میری عورت اور بالک رہتے ہیں۔ تم کو وہاں باجرے کی روٹی اور گڑ مل جائے گا۔ ایسے، چوری سے غش کھراب ہو جاتا ہے۔"

اُس کی ہمدردی سے میرا دل بھر آیا۔ کیا یہ دیہات والے جنہیں ہم حقیر سمجھتے ہیں، دوسروں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے؟ میں اُس کے ساتھ چلدیا، اور اُس کے گھر پہنچ کر مجھے اتنا بھی احساس نہ رہا کہ یہ بچارا اپنا پیٹ کاٹ کر میرے تن میں جان ڈال رہا ہے۔ رات گئے تک ہماری باتیں ہوتی رہیں۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہنے لگا "بڑا گھراب جمانا ہے گردھاری! پر کیا کریں جندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔ تم صبح میرے ساتھ چلنا، میں اپنے مالک سے کہہ کر تمہیں کارکھانے میں ملاجم رکھا دوں گا۔ وہ بہت دیالو ہے اور مجوروں کی اُسے جرُورت پڑتی رہتی ہے، چار آنہ روج ملیں گے۔ تم کو بو ہوت ہیں۔

......اور یوں تو بڑے بڑے بابو بالسٹری پاس کر کے بھی بھوکوں مرتے ہیں۔"

"میں مزدوری کروں گا؟" میں نے دل میں کہا "سات آٹھ روپئی سے میرا کیا کام چل سکتا ہے۔" مگر پھر مجھے اپنے فاقوں کا خیال آیا اور میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا "ہاں ہاں گوری شنکر تم مجھے نوکر کرا دو، میں محنت مزدوری کر لوں گا۔"

کارخانے کا مالک رتن لال بڑا بدمزاج اور مغرور شخص تھا، اس کے چہرے سے شرارت ٹپکتی تھی، اور تمام مزدور اس سے بیحد ڈرتے تھے۔ گوری شنکر کی منت سنکر ایک دفعہ اور اس نے مجھے سر سے پیر تک حقارت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "تو تم نوکری کروگے؟ ہوں!! پھر تم سے کاہے کٹیں گے؟ کدال تم سے کیسے چلیگی؟ تم تو بابو ہو بابو! تم نے اس لالچ میں پڑھا کہ سرکار تمہیں نوکری دیدے گی۔ جاؤ نا اب اُس کے پاس! تمہیں ان حالوں پھرتے دیکھتے اُسے لجا نہیں آتی؟" مجھے اپنی بیکسی پر رونا سا آگیا کہ یہ پڑھائی تو بجائے فائدہ پہونچانے کے اُلٹی جڑ ہی کاٹ رہی ہے۔

رتن بولا۔ "اور تم سے نوکری ہوگی کیسے؟ ذرا اپنا بدن تو دیکھو، ایک پھاوڑے میں تمہارا تو بازو اُتر جائے گا" لیکن میں نے پھر بھی گوری شنکر کے ساتھ اُس کی خوشامد کی جسے سُنکر اُس نے تکبر سے کہا "کیوں بے گوری! یہ تیرا باوا لگتا ہے کیا؟ کیوں سر ہوئے جاتا ہے؟........ اچھا خیر جاؤ کام کرو، مگر انیس نہ ہو، ورنہ دو آنے بھی نہ ملیں گے۔"

چار پانچ گھنٹے تک بمشکل تمام میں کام کرتا رہا، جسم پڑا ہو گیا اور بازو اور کمر شل ہوگئی۔ میں اپنی قسمت پر آپ ہی آگ بگولا ہو رہا تھا، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ رتن مزدوروں کو ڈانٹتا ڈپٹتا چلا آرہا ہے۔ کسی کو لات ماردی، کسی کو موٹی سی گالی سنائی، اور کسی کی پگڑی پر زور سے لپڑ دیا۔ میں اسے کیسے برداشت کرلیتا، چنانچہ میں نے سوچ لیا کہ اگر مجھ سے کچھ بولا تو اس کو گھڑے رکھدوں گا۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں الجھا اور چپ چاپ میرے پاس سے گذر گیا۔

(۲)

میں جس کارخانہ میں ملازم تھا وہاں نیچ قوم کی عورتیں بھی کام کرتی تھیں مجھے یہاں کام کرتے چند مہینے ہوئے ہوں گے کہ ہم میں ایک نئی عورت شامل ہوئی جو

ذات کی چماری تھی۔ مگر دیکھنے میں ایسی نہیں معلوم ہوتی تھی، اُجلا رنگ، درمیانہ قد اور اچھا ناک نقشہ۔ گوری شنکر کہنے لگا "وہ جو بڑھیا شربتی تھی نا، وہ سوموار کو مر گئی، یہ اُسی کی لونڈیا ہے۔ بابو جی نے کرپا کر کے اُسے اپنے ہاں ہی نوکر رکھ لیا ...... بچاری اکیلی ہے" بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ دن یوں ہی گذرے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ۔ ع:۔

ہم بھی ہیں تیرے پرستاروں میں

مگر مشکل یہ آن پڑی کہ اُس کی سگائی ہو چکی تھی اور اُس کا میاں ایک آدھ دن میں آنے والا تھا۔

بھادوں کی ایک شام تھی اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سورج دیوتا لال، پیلے رنگ بدلتے ہوئے پچھم کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ اور سونا ٹخنوں سے اونچا لہنگا اٹھائے گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح ہولے ہولے چل رہی تھی۔ میں بھی تھوڑے فاصلے پر اس کی گوری گوری پنڈلیوں کو آنکھوں میں بسائے چھپتا چھپاتا چلا جا رہا تھا۔ جھونپڑی تک پہونچتے پہونچتے اندھیرا پھیل گیا، اور اس کے بالوں جیسی کالی رات چاروں طرف بکھر گئی۔ میں جھونپڑی کے پیچھے ایک کونے میں کھڑا ہو کر ایک موکھے میں سے اُسے دیکھنے لگا، اُس نے اندر آکر پہلے دیا جلایا اور پھر ایک ہنڈیا کی طرف بڑھی کہ دفعتاً ——— میں نے دیکھا کہ ...... وہ مہا دیا لو، سیٹھ رتن لال جی شراب پئے ہوئے سونا کی طرف چلے آتے ہیں۔ سونا ایکا ایکی "کون؟" کہکر پلٹی۔ اور رتن نے ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "سونا! ——— تو ڈر گئی؟ ...... اری پگلی میں تجھے ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں ...... میں تجھ سے شادی کرونگا ...... آمیرے پاس آ" اور اُس نے اپنے مضبوط ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیے۔ سونا سہم کر پیچھے ہٹی "کیا کہتے ہو مہاراج! میرا آدمی آجکل میں آجائیگا۔ تو وہ ......"

"ارے چھوڑ اس آدمی کو ...." رتن بات کاٹ کر بولا "تیرا گونا تو نہیں ہوا پھر کس بات کا فکر کرتی ہے؟ مجھ سے سادی کرے گی تو تجھے سیٹھانی بناؤں گا- اور ...... یہاں تو آ ......"

"سچ کہتے ہو مہاراج!" سونا سراسیمگی کی حالت میں کہنے لگی " پر دھرم بھی تو نشٹ ہو جائے گا، آتما بھی تو پاپن ہو جائے گی ......"

"پگلی کہیں کی ......" رتن اُس کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا "بس چپکی ہو جا ......"

اُس نے دیئے کو پھونک مار کر بجھا دیا- تھوڑی دیر تک آوازیں آتی رہیں "کیا کرتے ہو بابو ...... رہنے دو ...... میں بیاہتا ہوں ...... میرا آدمی ......" اور پھر مکمل تاریکی اور خاموشی چھا گئی-

میرے پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے اور اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُس سنگدل سے کشتم کشتا کر سکتا لہذا جس طرح ہو سکا میں بھاگم بھاگ گوری شنکر کے گھر پہونچا، اور اُسے جھنجھوڑ کر تمام واقعات سے آگاہ کیا- غصے میں اس کا خون اونٹنے لگا- اور اس نے میرے ساتھ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کہا "ہاں کسم سر پھوڑ دوں گا سُورے کا- کیا سمجھا ہے اُس نے؟ کسو کی اِجّت لینی کوئی مجاک ہے کیا؟"

جب تک ہم وہاں پہونچے، رتن وہاں سے جا چکا تھا اور جھونپڑی کے اندر سے آہ و بکا اور سسکیوں کی آوازیں اِس طرح آ رہی تھیں گویا رات سبکیاں لے لے کر رو رہی ہو-

(۳)

صبح ہوتے ہوتے گوری شنکر نے بہت سے مزدوروں کو خبر کر دی- مگر جب

رتن کو معلوم ہوا تو اس نے بھی تھوڑی دیر میں سارا بندوبست کر لیا۔ کسی کا دھمکی سے اور کسی کا پیسے سے منہ بند کیا اور جو ذرا جی دار تھے پولیس کو روپیہ کھلا کر الٹا انہیں کو پھنسا دیا۔ ہم دونوں صاف بچ گئے۔ میں اس لئے کہ میری مزدوری چار آنے سے چھ آنے کر دی گئی۔ اور گوری اسلئے کہ وہ رتن کے ہاتھ نہ لگا۔

اُسی روز سونا کا شوہر جو ایک گبرو جوان تھا آپہونچا۔ لیکن رتن کے سکھائے ہوئے آدمیوں نے سونا کو بدنام کر کے اُسے اُس سے بدظن کر دیا۔

شام ہونے کو آئی، چرواہے بھیگی ہوئی بانسریوں کو بجاتے گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کو ہنکائے لئے جاتے تھے کہ گوری ایک درخت کی آڑ میں سے نکل آیا اور میرے پاس بیٹھ کر ہولے سے کہنے لگا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے اُس کے باوقار چہرے پر سنجیدگی کی جھلک دیکھ کر رسان سے جواب دیا "جیون کو بوجھنے کی کوشش کر رہا ہوں"

وہ شاید کچھ سمجھ گیا۔ کیونکہ اُس کے ہونٹوں پر حقارت آمیز اور طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ "ہوں!!...... ہاں، سونا کا اب کیا ہوگا؟ ۔........ اُس کا آدمی روٹھ کر چلا گیا ہے"

"رام جانے" میں نے مونگ پھلی کے دانے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "امیر غریبوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے ہیں اور سرکار بھی غریبوں کی حمایت نہیں لیتی"

"سرکار نہ لے تو نہ سہی" اُس نے فوراً ہی جواب دیا۔ "اور ہم گریب ہیں تو کیا ہوا موقع ملے تو میں اس بدمعاش کا خون چوس لوں گا........ ان بزدلوں کو دیکھو اُس چنڈال سے ڈر گئے...... تم تو میری مدد کرو گے نا؟"

گویا مجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا "نہیں، نہیں" میں نے کہا "میں کچھ نہیں کر سکتا۔ امیر اپنے ہتھکنڈوں سے غریبوں کو تباہ و برباد کیا ہی کرتے ہیں.......... اور پھر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور اُسکی آواز میں تلخی آ گئی "ہاں لالہ گردھاری مل تم بھلا کیا کر سکتے ہو؟ تم تو امیروں کو خوش کرنے کے لئے اُن کے ہاتھوں اپنی اِجّت اور دھرم بھی بیچ دو گے!"

"عزت اور دھرم کو تو گھر چھوڑ دیا" میں نے کہا "وہاں سے تو بس پیٹ لیکر چلا ہوں.........مجبوری ہے"

"ہاں مجبوری ہی تو ہے! تم شہریوں کے" وہ نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا "میں تو ایسی مجبوری پر لات مار چکا ہوں"

"باؤلے ہوئے ہو، تم ٹھاکر؟" میں نے اسے گویا سمجھاتے ہوئے کہا "بیوی بچے جو ہیں تمہارے! اور یہ سات آٹھ سال کی نوکری!!"

"پیٹ تو تم لیکر چلے ہو چودھری! میں ایشور کے گھر سے دھرم اور اِجت لایا ہوں" اُس نے میرے جواب میں کہا" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

اب آپ ہی بتایئے گوری بیوقوف نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر میں بھی نوکری چھوڑ دیتا تو آج یہ ٹھرے، چٹ پٹی دال اور بھنے ہوئے چنوں کے لئے دھیلی پاؤلی روز کا خرچ کہاں سے چلتا؟۔

۱۹۳۸ء

حسن رہگذر

کالج جاتے ہوئے بازارِ حُسن ہی سے گذرنا پڑتا تھا۔ دونوں طرف بالاخانوں پر بیٹھی ہوئی مختلف عمروں کی عورتیں جاذبِ نگاہ کپڑے پہنے اپنی دلکش آرائش کیا کرتی تھیں، اور اُن کا حُسن جس میں معصیت اور بناوٹی معصومیت کی ملی جُلی جھلک ہوتی فروخت کے لئے برسرِ راہ تھا۔

بی۔ اے کا طالب علم اور اُنیس ۱۹ بیس سال کا نوجوان، اسلم سعید ابھی حُسن وعشق کی کشمکش سے ناواقف تھا۔ چند ماہ پہلے دونوں باپ بیٹے کالج ساتھ ساتھ جاتے تھے جہاں اسلم کا باپ سعید اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ اس لئے اور بھی اُسکی نظریں کسی شاہدِ رعنا پر پڑنے سے پہلے ہی فضا میں بھٹک جاتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے دونوں کا ساتھ نہیں ہوتا تھا اور کالج آتے جاتے اسلم کی معیت میں عموماً بے تکلف دوست — کالج کے منچلے نوجوان — ہوتے جن کے لئے دوسروں کی نگاہ ہیں

بچاکر کسی جوان عورت کو ایک نظر دیکھ لینا لازمۂ شباب تھا۔ تمام راستے دلفریبیِ حسن اور لذتِ عشق پر گفتگو رہتی اور گاہے گاہے کنکھیوں سے بالاخانوں کی زیارت بھی کرلی جاتی تھی۔ کبھی کوئی اپنی جھوٹی آپ بیتی سناتا اور کبھی سستے ناولوں کے جذبات کو بھڑکانے والے رومان دُہرائے جاتے۔ اسلم نے حسبِ عادت پہلے پہل تو ان رنگین باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ان کو مزے لے لیکر سننے لگا۔ اور کبھی کبھار طبیعت جولانی پر ہوتی تو عشق کی کارفرمائی سے متعلق وہ ایک آدھ شعر بھی سُنا دیتا تھا۔

پھر ایک دن وہ آیا جس کی واردات سے یہ افسانہ مرتب ہوا۔ اسلم کی نظر میں جن میں جوانی کی لہر آچکی تھی، بالاخانوں پر پڑتے پڑتے ایک کم عمر پیکرِ جمال پر مرکوز ہوگئیں جس کے نقوش، ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد ہمیشہ کے لئے لوحِ قلب پر مرتسم ہو جاتے تھے۔ پندرہ سولہ کی عُمر، سڈول جسم، سُرخ و سفید رنگ، خوبصورت مکھڑا، چہرے پر شادابی، لبوں پر نزاکت، آنکھوں میں شوخی —— گویا جوانی حُسن میں سے پھوٹا پھوٹ کر نکل رہی ہے۔

مطلع ابر آلود تھا اور کیف آور فضا ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اسلم خیالات میں کھویا ہوا کالج جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب کے سمندر میں موجیں اُٹھ اُٹھ کر دامنِ کوہ سے ٹکرا رہی ہیں۔ چلتے چلتے وہ یکایک چونکا ...... وہی جانِ جہاں ہلکی دھانی ساری میں ملبوس موٹر سے اُتر رہی۔ آس پاس کے وہ لوگ بھی جن میں جوانی سسک رہی تھی، اُسے بدنیتی نظروں سے گھورنے لگے۔ اُس نے اسلم پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور فوراً ہی سامنے سے گذر کر اپنے بالاخانے پر چلی گئی۔ اسلم مورت بنا ساکت کھڑا رہا۔ اُس کے جذبات کا طوفان تعلیم اور مذہب کے بند توڑ دینا چاہتا تھا —— دفعتاً تھوڑے فاصلہ پر ایک بالاخانے

سے شور و غل بلند ہوا اور ایک دردناک چیخ فضا کو چیرتی ہوئی اسلم کے کانوں میں گونجی ——— کسی عورت بازاری کے آستانے پر اُس کے رقیبوں میں لڑائی ہو گئی تھی۔ جس کا ہولناک انجام یہ ہوا کہ ایک شخص نے اپنے رقیب کے چھری بھونک دی

۲

کالج پہونچکر اسلم کو معلوم ہوا کہ ہال میں اخلاقی درس سے متعلق اُس کے باپ کا لکچر ہو رہا ہے۔ پروفیسر سعید کا لکچر اس کی مؤثر اور دلکش آواز، مناسب اور عمدہ الفاظ، بلند اور فلسفیانہ خیالات اُس کی تقریر کے خاص جوہر تھے، جسے سُننے کے لیئے چھوٹا اور بڑا، متعلّم اور معلّم سب ہی منتظر رہتے تھے۔

لکچر ختم ہونے کے بعد آپس میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ ایک پروفیسر کہنے لگا "آج سعید بڑے جوش میں تھے"

دوسرے نے جواب دیا۔ جوش میں ہوتے کب نہیں ہیں؟ یوں کہو کہ آج جو اُنھوں نے اپنے لئے موضوع منتخب کیا وہ نہایت اہم تھا"

تیسرے صاحب بولے "اس موضوع پر اس سے بہتر تقریر نہیں ہو سکتی"

ایک طالب علم نے دوسرے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "دیکھا، ظالم نے کیسی دوشالے میں لپیٹ کر ماری ہیں؟ تم آج کے لکچر سے عبرت حاصل کرو، تم کو اپنی جوانی پر بہت گھمنڈ ہے"

"جوانی پر گھمنڈ کرنا تو کوئی عیب نہیں" ایک بے تکلّف دوست لاپرواہی سے بولے "ہاں جیسا کہ پروفیسر صاحب نے کہا نظربازی نہیں کرنی چاہیئے"

"نہیں بھئی یہ تو اُن کی زیادتی تھی" ایک اور صاحب نے گویا مسکت جواب دیکر معاملہ ختم کر دیا۔

اسلم عجیب اُلجھن میں تھا صبح کو یہ بیتی۔ اور اب باپ نے یہ درس دیا۔ تمام دن طبیعت پریشان رہی اور کالج کے روکھے پھیکے لکچر دلچسپی سے یکسر خالی رہے کبھی حُسن کی اُسکے نوآموز محبت دل میں تڑپ پیدا کرتی اور کبھی باپ کی تقریر کا خیال اسکے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا کر دیتا۔ ایک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا وہ تقدیر کی شہ پر غور کر رہا تھا کہ خیالات اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے اور باپ کے الفاظ اس طرح سنائی دینے لگے گویا سعید اُسی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔

"........ جوانی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے، اس کے کھو جانے کے بعد دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اس کی تلافی نہیں کر سکتی .... بچپن اور بڑھاپا یکساں اور لایعنی زمانے ہیں۔ جن میں انسان دوسروں کا محتاج رہتا ہے جب تم بچے تھے تو تمہاری نگاہیں والدین پر رہتی تھیں، کہ ماں تمہارا پیٹ بھر دے۔ اور باپ تمہارا تن ڈھک دے۔ جب بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہارے ہاتھ پاؤں جنبش کرنے کے قابل نہ رہیں گے اُسوقت تم مجبور ہو گے کہ تمہاری اولاد اپنے بال بچوں کو دیکھنے کے بعد جو کچھ بھی تمہیں کھانے اور پہننے کو دیدے اُسے بصد خوشی قبول کر لو ......

لیکن جوانی وہ عمر ہے جب تم آزاد اور خود مختار ہوتے ہو جہاں چاہا ہے، جو چاہا کھایا اور جیسا چاہا پہنا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انسان کی زندگی بنتی یا بگڑتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جوانی زندگی کا امتحان ہے، پاس ہو گئے تو انسان، اور فیل ہوئے تو شیطان! وہ شیطان جس پر ہر وقت اور ہر طرف سے لعنت و پھٹکار برستی ہے ....

سولہ سے چوبیس سال تک! یہ وہ عمر ہے جب خدا انسان کی طرح طرح سے آزمائش کرتا ہے، ذرا پاؤں ڈگمگایا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے زہریلے کانٹوں نے لہولہان کر دیا .... اور پھر اس راہ پر حُسن کی آغوش میں عشق مچلتا نظر آتا ہے .... جوانی انگڑائی لیکر بیدار ہوتی ہے اور بھولے بھالے نوجوان صحیح راستے سے بھٹک جاتے ہیں ...... منزل مقصود خواب کے مندر کی طرح دم بدم دور ہوتی جاتی ہے، اور

اُن کے بدلے زندگی کے رنگین ٹھکانے نظر آتے ہیں ...... رنگین ٹھکانا! جیسے کاشانۂ الفت سمجھکر پرستش گاہ کا درجہ دیا جاتا ہے، جیسے قصرِ محبت سمجھکر اُس کے آستانے پر جبہ سائی کی جاتی ہے! سمجھے تم؟ اور انجام کیا ہوتا ہے؟ —— مٹی کے گھروندے! جنہیں زمانے کے طاقتور پاؤں نے روند کر مسمار کردیا ہو محبت؟ نہیں، نہیں، سراب! دلدل! بلکہ ریگِ رواں، جہاں قدم رکھا اور انسان زمین میں دھنسنا شروع ہوا، لاکھ کوشش کرو، نکلنا محال، گویا جیتے جی تدفین ہورہی ہے.... ..... تمہیں اُن بدنصیب نوجوانوں کی ناکام زندگی سے سبق لینا چاہئے جو انجان یا تعلیم سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنی بربادی کی ابتدا بازاری محبت میں مبتلا ہو کر کرتے ہیں اور جن کے کان ایک حُسن فروش کی سیج کے بکھرے ہوئے پھولوں کی داستانِ عبرت سننے کے لئے ہمیشہ کیلئے بہرے ہوجاتے ہیں۔ بیشک اِس موقع پر ضروری ہے کہ والدین اُن کی سختی سے خبرگیری کریں۔ مگر درحقیقت سب سے بڑی خبرگیری خود کی جاتی ہے جس نے اپنے دامن کو اِس وقت معصیت سے بچالیا اُس کی ہمیشہ فتح رہے گی...... بچو! بچو! سائے تک سے ایک حُسن فروش محبوبہ کے، جس کا ڈستا پانی کے ہوتے ہوئے بھی اُسے پی نہیں سکتا۔ اور پیاسا ہی دم توڑتا ہے۔"

۳

اسلم بچا بچاتا شام کو گھر پہونچا۔ سال بھر کے بچھڑے ساون بھادوں گلے مل رہے تھے اور کالی کالی گھٹائیں پورب اور پچھّم سے گھر گھر کر آرہی تھیں۔ اُس نے بےچینی سے کروٹ بدلتے ہوئے مایوسی سے کہا۔ "آخر انجام کیا ہونا ہے؟" دل اور دماغ آمادہ پیکار تھے کبھی اس کی یکایک جاگی ہوئی محبت اس کے باپ کو اِس طرح شکست دیدیتی گویا اُس کے الفاظ کبھی نہ سُلجھنے والے گورکھ دھندے ہیں۔ اور کبھی باپ کی نصیحت اُس کے جذبات پر اِس طرح فتح پالیتی گویا وہ اُس کے سامنے کھڑا ہوا کہہ رہا ہے۔ "جانِ پدر نہ

......یہ محبت نہیں، جوشِ جوانی ہے —— دودھ کا سا اُبال...... عارضی! مہلک؟ تباہی کا نقیب!........" اور پاس ہی آتش دان میں سے سُلگتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے کسی احمق کے بے معنی قہقہے کسی سنجیدہ گفتگو کے دوران میں بے موقع بلند ہو جائیں۔

آہستہ آہستہ بادل چھٹ گئے۔ اور وسیع نیلے آسمان پر رنگ برنگی ستارے جھلمل جھلمل کرنے لگے۔ جیسے کسی حسین دوشیزہ کے دستِ نازک پر زمرد و یاقوت رقص کر رہے ہوں۔ اسلم کی نیم وا آنکھیں یکبارگی پوری کھُل گئیں اور وہ اپنے دل کی دھڑکن کو ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا ——

سامنے آسمان پر شہابِ ثاقب ٹوٹا۔ اور ایک دوسرے ستارے میں جذب ہونے کے لئے اُس میں جا ملا۔

—— اور جب کسی کا دل مچل جائے تو بزرگوں کی یہ نصیحتیں، قانون کی یہ سختیاں، دوزخ کی یہ آتشیں لپٹیں کیا حقیقت رکھتی ہیں؟ باپ کو شکست فاش ہو گئی، اب جوانی کی حکومت تھی اور جب جوانی برسرِ اقتدار ہو، زہد و اتقا بھی پاس آتے ہوئے تھراتے ہیں۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا آخر کار اُس بازار میں پہنچ جہاں باوجود اسکے کہ بازاری دوشیزاؤں پر فریفتہ ہونیوالوں کے حسرتناک واقعات آئے دن سُننے میں آتے رہتے ہیں ادولت اور حسن کا بیوپار نہایت کامیابی سے ہوتا ہے۔

جے ہو جوانی کی! —— جبتک چہرے پر دو چُلّو خون کی رونق ہے روپے کے بل پر چاہے جتنی محبت خرید لیجئے۔ آج اسلم کی جوانی دنیا اور مذہب کی تمام زنجیریں توڑ کر آزاد ہو چکی تھی چنانچہ بغیر کسی خوف و خطر کے وہ بالاخانہ پر چڑھ کر درانہ عشرتکدے میں داخل ہو گیا، لیکن اس نے دیکھا کہ وہ نیم عریاں پیکرِ جمال ایک مرد کے آغوش میں مچل رہا ہے۔ ایکا ایکی آہٹ سے چونک کر وہ مرد پلٹا۔ آنکھیں چار ہوئیں اور اسلم کے لبوں پر ایک لفظ کانپ کر رہ گیا —— ابّا!

(۱۹۳۷ء)

سوزِ حیات

جب تک قید خانے کا نگراں رہا میری یہ عادت تھی کہ جس قیدی پر مجھے ترس آتا میں اُس سے فرصت کے لمحات میں گھڑیوں باتیں کرتا تھا۔ اس سے کچھ تو قیدی کے دل کی بھڑاس نکل جاتی اور کچھ مجھے کتاب زندگی کے مختلف ابواب کے مطالعہ کا موقع مل جاتا۔ کبھی ایسا ہوا کہ میں نے کسی قیدی سے اُس کی روداد حیات سُننے کی خواہش کی اور اس نے اُسے ٹھکرا دیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں نے کسی قیدی سے ہمدردانہ گفتگو کی تو اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس دوران میں جس قیدی سے مجھے سب سے زیادہ ہمدردی ہوئی اُس کی کہانی چشم بینا کے لئے شاید عبرتناک ہو!۔

اُس قیدی کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ اسّی سال کی لاش تدفین کی مُنتظر ہے۔ جب اُس کی متوحش نگاہیں جیل خانے کے سنگین دروازے پر پڑتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا اُس کے چہرے پر مُردنی چھا رہی

ہے یا کسی بے گناہ مجرم کو پھانسی کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اسپر الزام یہ تھا کہ اُس نے کسی کی تصویر چھین کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اِس جرم میں عدالت نے اُسے سزائے قید دی تھی۔ بعض قیدیوں کی طرح وہ بدمزاج اور اکھڑ نہیں تھا۔ بلکہ اُس کی زدہ حالت اعتراف کر رہی تھی کہ زمانے نے اُس کے پندار اور غرور کو کچل کر رکھ دیا ہے۔

ہر طرف خاموشی اور تنہائی تھی۔ کبھی کبھار فصیلوں سے باہر گیدڑوں کے بولنے۔ یا اکّا دکّا قیدیوں کے کھانسنے کی آواز اس سکوت کو توڑ دیتی تھی۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ میں اُسے تمسخر کی غرض سے نہیں چھیڑ رہا تو اُس نے اپنی رام کہانی یوں بیان کی۔

۱

شادی کے وقت میری عمر بیس۲۰ بائیس۲۲ سال کی ہوگی۔ مگر میرے لئے اپنی دلہن میں اسقدر دلچسپیاں تھیں کہ مجھے خیال ہی نہ آیا کہ یہ عمر زندگی کا سب سے زیادہ شوخ اور رنگین زمانہ ہے۔ میری دلہن غیر معمولی طور پر حسین تو نہیں تھی۔ لیکن اس کی سادگی، اخدمت اور خاموش محبت نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ بڑی بوڑھیوں کی زبان میں، میں نے اُس کی ایڑی دیکھ کر کسی دوسری کی صورت نہ دیکھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے خوبصورت عورتوں سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ بہت سی جوان اور حسین، کنواری اور شادی شدہ عورتوں سے میرا میل جول تھا۔ علاوہ ازیں میں خود خوبصورت نہیں تو کریہ المنظر بھی نہیں تھا۔ بلکہ جوان تھا، خوش خُلق اور ہنس مکھ تھا اور سب سے بڑھکر میرے پاس دولت تھی ——— جس سے سوائے خدا کے ہر شئے خریدی جاسکتی ہے ———

شادی کے بعد میری دولت میں اور اضافہ ہوا۔ کیونکہ میری بیوی ایک متمول باپ کی بیٹی تھی جو جہیز اور ورثے میں میری دولت سے کئی گنی نقدی اور جائیداد اپنے ساتھ لائی۔ ایک سال بعد ہمارے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور وہ ہم دونو کی تمام توجہات کا مرکز بن گیا۔ شادی سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ اولاد ماں باپ

کے لئے عیش و عشرت کے اختتام کا پیغام ہوتی ہے۔ لیکن رتن (آپ مجھ سے صحیح ناموں کی توقع نہ رکھیں) جوں جوں بڑا ہو رہا تھا ہماری خوشیاں وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں بڑا ہونہار بچّہ تھا، نہایت ذہین، بیحد فرمانبردار، خوبصورت اور تنومند۔ دیکھتے ہی دیکھتے رتن جوان ہو گیا۔ اور وہ دن خواب ہوتے گئے جب میں اُسے سیر کرانے اپنی گود میں لیکر جاتا تھا۔ بہت جلد اس کی عمر کے اٹھارہ سال گذر گئے اور یہیں میری زندگی کے پُرسکون دریا میں ہلچل مچنی شروع ہوئی۔

ایک روز کا واقعہ ہے میں اپنی عالی شان عمارت کے اندرونی کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ دُکان کا منتظم میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ایک خاتون نے کچھ سامان خریدا ہے اور وہ قیمت میں کچھ کمی چاہتی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ قیمت میں کمی نہیں ہو سکتی۔ تو وہ بولیں کہ اپنے مالک سے جا کر کہو۔ اب آپ جو فرمائیں؟"

میں نے جواب دیا "اچھا اُن کو یہاں بھیجدو۔ میں خود اُن سے گفتگو کر لوں گا"

منتظم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک نازک اندام لڑکی اندر داخل ہوئی۔ بہت خوبصورت تھی۔ عمر بھی کوئی پندرہ سولہ سال ہوگی۔ گھنے اور لانبے بال کمر پہ بَل کھا رہے تھے، حسین مکھڑے پر شادابی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ پتلے ہونٹوں میں ایک حُسن خیز مسکراہٹ تھی اور نشیلی آنکھوں میں جوانی کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ غرض یہ کہ میں اس کے حُسن سے مسحور ہو گیا اور بجائے اس کے کہ چند لمحات میں معاملہ کو طے کر لیتا میں اس سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور وہ بھی اُن میں دلچسپی لیتی رہی۔ اس کا نام بھی بہت خوبصورت تھا ——— آپ نیلم کہہ لیجئے ———

چلتے وقت میں نے اُس سے درخواست کی "کل میرے ساتھ چائے پیجئے" اسے اُس نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ دوسرے روز اُس نے مجھے مدعو کیا اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ ہم دونوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ وہ اکثر میرے پاس دفتر میں آ جاتی تھی اور میں اُس وقت تمام کام کاج چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہاں تک نوبت پہنچی کہ میں ہر روز اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن باوجود اس کے کہ میرا دل جوانی کی اُمنگوں اور والہانہ ولولوں سے از سرِ نو آشنا ہو رہا تھا مجھے یہ احساس بھی تھا کہ نیلم کا بے ضرورت روز روز دفتر میں آنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے نیلم سے کہہ سنکر اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ کہ وہ میرے گھر ہی میں مجھے ضروری کاموں میں مدد دیا کرے۔

۲

نیلم ایک اوسط درجہ کے مکان میں اچھے خاصے ٹھاٹ سے رہا کرتی تھی اور چونکہ میرا دل روز بروز اس کی طرف مائل ہو رہا تھا اس واسطے میں بھی اُسے ایک معقول رقم ہر ماہ دیدیا کرتا تھا۔

میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا لڑکا اب خاصا بڑا ہو گیا تھا اور ضرورت کے مطابق اُس نے تعلیم بھی اچھی حاصل کر لی تھی۔ اس لئے میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ میں رتن کو اپنے ساتھ کام سکھاؤں تاکہ اُسے کام کی عادت پڑے۔ شروع شروع تو میں ٹالتا رہا۔ لیکن جب میری بیوی مُصر ہوئی اور میں کچھ کچھ رضامند ہوا تو نیلم نے حالات ہی بدل دیئے۔ آپ ہی بتایئے کہ اس صورت میں جبکہ جوانی کے بادل میرے سر پر منڈلا رہے تھے، کیسے اپنے جوان بیٹے کا اس دفتر میں کام کرنا مناسب سمجھتا جہاں نیلم روزمرہ تجمل کی تجلیاں برساتی تھی۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد میں نے اپنی بیوی سے کہا۔" اور تھوڑے دنوں اُسے آرام کر لینے دو۔ پھر بھی کام کرے گا۔ جب تک آزاد رہے اچھا ہے، کام سنبھالے پیچھے تو اُسے سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہ ملیگی۔" اور اس طرح میں نے اس خطرے کو دور کر دیا کہ کہیں میرے لڑکے اور نیلم کا آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ حالانکہ مجھے چاہئے تھا کہ اب جبکہ وہ ہوشیار ہو گیا تھا اُسے کام میں لگائے

رکھتا۔ مگر آہ! ـــــــ یہ جوانی!! مرد جوان نہ رہکر بھی جوان رہنا چاہتا ہے۔

عام طور پر میں سرِشام، دفتر کے کاموں سے فارغ ہوکر گھر پر آجاتا تھا اور جب سیر و تفریح کے لئے رات کو باہر نکلتا تو عموماً بیوی اور رتن ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن اب اس دستور میں فرق آنے لگا اور میرے کئی کئی گھنٹے نیلم کے ساتھ دفتر ہی میں یا کہیں اور بسر ہوتے تھے۔ بیوی کی طبیعت بہت نیک اور خاموش تھی، اُسے یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ مرد کی متلون طبیعت، بیوی کی رعنائی کم ہوجانے کے بعد اچھی صورت کا اثر جلد قبول کرلیتی ہے۔

ایک دفعہ نیلم علالت کی وجہ سے دو روز تک دفتر نہیں آئی۔ میرا دل اسکی طرف اسقدر کھنچ چکا تھا کہ اس کی غیر حاضری مجھے بڑی شاق گذری۔ جوں توں کرکے دفتر کا کام ختم کیا اور شام ہوتے ہی سیدھا اس کے گھر روانہ ہوا۔ نیلم کا خیال آتے ہی میرے دل میں خوابیدہ جذبات مچلنے لگے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں پھر سے جوان ہورہا ہوں۔

میں جب اُس کمرے میں داخل ہوا جہاں نیلم ایک نرم و نازک بستر پر محو استراحت تھی تو مجھ پر ایک کیف بیخودی طاری ہوگیا۔ دریچوں میں کاسنی رنگ کے ریشمی پردے ہوائی لہروں میں جھول رہے تھے اور خوشنما دیواروں پر آویزاں تصویریں محبت کی تفسیر بیان کررہی تھیں۔ بستر کے قریب چھوٹی سی تپائی پر ایک حسین و جمیل کتاب رکھی تھی۔ جس کا ایک دلکش افسانہ وہ پڑھتے پڑھتے سوگئی تھی۔ اس افسانہ کا تعشق آمیز عنوان پڑھکر میرے جسم میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ اور جب میں نے نیلم کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ میں علائق دنیا کو توڑ کر کسی انوکھی اور خواب آور بستی میں چلا گیا ہوں۔

مطلع ابر آلود ہو چلا تھا اور اُسوقت وہ نیلی ساری میں معمول سے کہیں زیادہ دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ میں بستر پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے اُسے آواز دی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے چہرے سے تکان ظاہر ہو رہی تھی۔ اُس کے گلابی رخسار، احمریں لب، اور معطر فضا نے مجھے بیتاب کر دیا۔ یہاں تک کہ میں ......

بے اختیار اُس کی طرف بڑھا اور دنیا ومافیہا سے قطعی بے خبر ہو گیا ——

میں بھول گیا، بیوی کو بھول گیا، اپنے آپ کو بھول گیا، بچے کو بھول گیا، جوان بچے کو! سب کچھ بھول گیا —— آہ! یہ جوانی!! اندھی جوانی!!۔ فوراً ہی میں نے محسوس کیا کہ نیلم کے سیمیں بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے ہیں۔ اس پر تعجب کے ساتھ ساتھ میری محبت کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی اور میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "کیسی ہو نیلم؟"

"پہلے سے بہتر ہوں" وہ دلربایانہ انداز میں بولی "مجھے یقین تھا کہ تم مجھے دیکھنے کے لئے ضرور میرے پاس آؤ گے۔ تم کو دیکھ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ مبادا میری بیداری تمہارے اظہارِ محبت میں مانع ہو"

اُس کے اِن الفاظ سے میری محبت انتہا کو پہونچ گئی۔ اور مجھے یہ احساس بھی نہ ہو سکا کہ میں کیا کر رہا ہوں، ہاں بعد میں مجھے ندامت ہوئی مگر یہ ندامت صرف نیلم کی غیر موجودگی میں تھی، اُس کے پاس ہوتے ہوئے، ندامت گویا میرے لئے کبھی تخلیق ہی نہیں ہوئی۔

میری بیوی میرے معاشقہ سے بالکل بے خبر تھی بلکہ اُس کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ میں کئی روز کے لئے نیلم کے ساتھ ایک دوسری شہر میں چلا گیا تھا اور میں نے اِس کی وجہ کاروبار بتائی تو میری بیوی کو یقین آگیا۔

جوں جوں دن گذر رہے تھے میں قدرتاً نیلم پر زیادہ روپیہ صرف کر رہا تھا۔

ماہوار رقم کے علاوہ میں اکثر اُسے تحائف بھی پیش کرتا رہتا۔ مگر نیلم اسے بھی کافی نہ سمجھتی تھی۔ ایک دن اس نے خواہش کی کہ میں اُسے ایک اچھا سا مکان دلوادوں جو ساز وسامان سے آراستہ ہو۔ میں نے یہ بھی کر دیا اور وقتاً فوقتاً اسکی دوسری خواہشات بھی پوری کرتا رہا۔ اس طرح ہمارے تعلقات تین چار سال تک قائم رہے اور کسی کو اس کا علم نہ ہو سکا۔

بالآخر نیلم کی فطرت رنگ لائی اور اُس کی نازیبا حرکتوں نے میری آنکھیں کھولیں کیونکہ وہ میری محبت کا ناجائز فائدہ اُٹھانے لگی تھی۔ تھوڑے دنوں میں میں معاملے کی تہ کو پہونچ گیا۔ اس کا یہ طرز عمل اس لئے تھا کہ وہ مجھ کو اپنے قبضے میں سمجھتی تھی....

...... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں جگ ہنسائی سے بُری طرح ڈرتا ہوں اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں اپنی عزت کو بچانے کیلئے اور اس لئے کہ میری بیوی اور دنیا کو میرے اس تعلق کا علم نہ ہو میں اُس کی ہر زیادتی کو برداشت کرلوں گا۔ آہ! بدنامی کا خیال اب مجھے لرزہ براندام کرنے لگا۔

پھر یکایک ایک رُوح فرسا سانحہ پیش آیا۔

ایک شب بے وقت اور خلاف معمول میں اُس سے ملنے چلا گیا۔ ابھی میں اُس کے گھر سے تھوڑے فاصلے ہی پر تھا کہ میں نے اُس کو ایک نوجوان شخص کے ہمراہ باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا سنگدل نے میرے کچے زخم کو ایک زنگ آلود نشتر سے چیر دیا ہے۔ میں نے سوچا کہیں یہ مجھ پر جال تو نہیں بچھا رہی؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے اُس پر نگاہ رکھنی شروع کی اور آخر کار میرا شبہ صحیح نکلا ـــــ وہ دوسرے لوگوں سے تعلقات قائم کر رہی تھی! اب مجھے معلوم ہوا کہ میں اس وقت تک فریب میں مبتلا تھا اور میرے جذبات کی بساط پر دولت کی چالیں چلی جا رہی تھیں۔ چنانچہ ایک روز جب میں اپنے غصے اور رنج پر قابو نہ پا سکا تو میں نے

جھلّا کر کہا "تمہیں معلوم ہے کہ میں تم پر اپنی دولت کیوں برباد کر رہا ہوں؟ کیا اس لیے کہ اس طرح تمہارے چاہنے والے پیدا ہوں؟ - یہ مکان میرا ہے اور جب تک میں تم پر اپنا روپیہ اُٹھا رہا ہوں اُس وقت تم کسی اور سے تعلق پیدا نہیں کر سکتیں! سمجھیں؟"

"نہیں میں نہیں سمجھی" نیلم اطمینان سے بولی "یہ میری مرضی ہے کہ میں مخلص دوست پیدا کروں کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ کبھی میری بھی شادی ہو جائے۔ تم نے تو یہ پاک رشتہ قائم کرنے سے انکار کر ہی دیا ہے اسلئے میں ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جو مجھ سے شادی کر لے - میں آخر ایسی زندگی کب تک بسر کروں گی؟"

پھر دفعتاً اُس نے پیار کے لہجے میں کہا "تم اپنی بیوی کو طلاق دیکر مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ میں نے اپنی جوانی تم پر اسی اُمید میں قربان کی تھی"

"ہاں" میں نے تندی سے کہا، اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں اسکے محبت بھرے لہجے سے متاثر نہیں ہوا "تم اپنی جوانی مجھ پر قربان کرتی رہیں۔ مگر صرف اسلئے کہ اسمیں تمہارا فائدہ تھا۔ تمہیں مجھ سے محبت تو کبھی نہیں ہوئی - رہی طلاق تو یہ خیال ہی تمہاری حماقت ہے"

وہ تیزی سے بولی - "شاید تم سچ کہتے ہو! لیکن اگر میں تمہاری بیوی کو اس تعلق سے باخبر کر دوں تو کیا انجام ہو؟"

میں یہ سنکر دنگ رہ گیا۔ واقعات نے میرے ہاتھ کاٹ دیے تھے اور میں اس کے آگے بے بس تھا۔ میرے کہنے سننے کا اسپر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ تباہی کے سائے میری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس تعلق کو ختم کرنا چاہوں تو نیلم میری رسوائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریگی۔

جب میری کسی بات پر ضد کرتی تو میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ اس کی خواہش کو روک سکوں۔ اب کہ رتن کے لئے واقعی ضروری تھا کہ وہ میرے ساتھ کام شروع کرے۔ بیوی نے ایک روز بہت شد و مد کے ساتھ اسپر اصرار کیا اور کونسی عقلمند ماں ہوگی جو یہ نہ چاہتی ہو کہ وہ اپنے بچّوں کے لئے دنیا میں جگہ پیدا کر دے؟ چونکہ میرے پاس اس سے متفق نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ اسلئے رتن نے دفتر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ مگر مجھے نیلم کی طرف سے بڑا کھٹکا تھا کہ اگر وہ دفتر میں آتی رہی تو کہیں اس کا وجود ایسی چھپی ہوئی چٹان ثابت نہ ہو جس سے ٹکرا کر ہماری زندگیوں کی کشتی پاش پاش نہ ہو جائے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد میرے اوہام مجھے حقیقی لباس میں نظر آنے لگے۔ نیلم اپنی پوری دلکشی اور رعنائیوں سے بھولے رتن کی توجہات اپنی طرف منعطف کر رہی تھی اُسنے اس کے دل پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے اپنی شیطنت کا پانسہ پوری مکّاری سے پھینکا تھا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ رتن رفتہ رفتہ اسکی طرف مائل ہو رہا ہے۔ آخر جب میں برداشت نہ کر سکا تو میں نے ایک روز نیلم سے کہا "نیلم! میں یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ رتن کو تم اپنے دام میں گرفتار کرو۔ وہی میرا سب کچھ ہے، میں کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ تم اُس کی زندگی تباہ کر دو؟"

"اچھا!؟" وہ طنطنا کر بولی "تو میں اُس کی زندگی خراب کر دوں گی؟ میں بھی تو ناسمجھ اور ناتجربہ کار تھی، تم ہی نے مجھ پر اپنی خود غرضی کا جال بچھایا اور مجھے محبت کرنی سکھائی۔ اور اب جب تمہارا دل میری طرف سے بھر گیا تو میں اس قابل بھی نہیں ہی کہ تمہارے لڑکے سے مل جل سکوں!۔ اچھا! اگر تم سے ہو سکے تو ہمارے تعلقات کو ختم کر دو اور دیکھو تمہارا نام کس طرح ساری دنیا میں اُچھالا جاتا ہے"

میں نے اُس کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی، ہاتھ تک کے جوڑے "ذرا انصاف

تو کرو نیلم! میں نے تمہاری ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی بیوی تک کا روپیہ تم پر صرف کیا ہے"۔

یہ حقیقت تھی اور میں اُسکی وجہ سے کافی پریشان تھا۔ میری بے عقلی نے میری فضول خرچی کو کہیں زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ اس لئے لامحالہ مجھے اپنی بیوی کا روپیہ جو میرے کاروبار میں لگا ہوا تھا کام میں لانا پڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ نفع کی صورت میں یہ روپیہ واپس کر دوں گا۔ مگر اتنی سمجھ نہ آئی کہ ہر آنے والا دن کاروبار کے نقصان کے علاوہ ایک بے قصور عورت کی تباہی بھی اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ مگر نیلم اس سے بھی متاثر نہیں ہوئی۔

"یہ تمہاری بدقسمتی ہے" وہ ہنس کر بولی "بات یہ ہے کہ میں رتن سے محبت کرتی ہوں۔ اسلئے میری کوشش ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے۔ اور میں کیوں نہ کوشش کروں؟ تم جانتے ہو کہ مجھے شادی کی تمنا ہے تو پھر رتن کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو جس کے باپ نے میری جوانی برباد کر دی؟ تم ہی بتاؤ اس سے بہتر کیا ہوگا کہ میں رتن کو محبت کرنا سکھا دوں؟ آخر اُس کے باپ نے بھی تو مجھے محبت کرنی سکھائی تھی!"

طیش، بیچارگی اور بے بسی نے میرا دماغ ماؤف کر دیا۔ "نفس پرست"۔ میں بے قابو ہو کر چیخا۔ "تو چاہتی ہے کہ ——— کہ ———" الفاظ میرے حلق ہی میں تھرتھرا کر رہ گئے۔

پھر اُس کا طنزیہ قہقہہ سُنکر میں نے کہا "میں تمہیں منع کئے دیتا ہوں کہ تم رتن سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھو! میں تمہارے پنجوں سے اپنے بچے کو چھڑا کر رہوں گا۔ بہتر ہے کہ تم اس کا خیال ترک کر دو، ورنہ تمہیں زندگی سے ہاتھ دھونے پڑینگے"۔

"خاصا بول لیتے ہو" اُس نے طنز آمیز حقارت سے کہا "اچھا تو سنو! میں تمہارے بیٹے سے شادی کر کے رہوں گی۔ جاؤ یہاں سے نکل جاؤ۔ اور اپنی تباہی کا

سامان پیدا کرو۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا ——— میں اس کے قبضے میں تھا۔ آہ! ان دنوں میں کس قدر روحانی اور جسمانی کرب میں مبتلا تھا! مجھے اپنے تئیں اور اس سے یکسر نفرت ہوگئی۔

کئی بار سوچا کہ اپنے بچے کو اس راز سے آگاہ کرکے اسے بتادوں کہ "اے جان پدر! میں تیرا اور تیری ماں کا گنہگار ہوں۔" لیکن اس کا معصوم چہرہ ہمیشہ مجھے اپنے ارادے سے باز رکھتا رہا اور اس کی مظلوم ماں کا تو خیال آتے ہی میں کانپ اٹھتا تھا۔ مجھے تخیل میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے سامنے مجروح کھڑی ہوئی ہے۔ اور اس کا چہرہ میرے سفلی کردار پر مجھے ملامت سے تک رہا ہے۔ لیکن اس کی معصوم آنکھیں کہہ رہی ہیں "تم ہی بتاؤ کیا یہ سچ ہے؟ کیا تم میرے ساتھ بیوفائی کرسکتے ہو؟"

ہفتے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے اور وہ دن بھی آگیا جب مجھ پر یہ معلوم کرکے بجلی سی گری کہ رتن کی نیلم سے محبت اتنی بڑھ گئی ہے جتنی کہ کبھی میری تھی۔ پاگلوں کی طرح میرے خیالات گردش کرنے لگے کہ میں کس طرح اپنے بچے کو، اپنے آپ کو اور اپنے گھر کی عزت کو آنے والی مصیبتوں سے بچاؤں۔

ایک دفعہ پھر میں نے اس کی خوشامد کی: "تم مجھ سے کچھ نقد لے لو مگر خدارا میرا دفتر اور میرا بچہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو۔"

اس نے جواب دیا۔ "فرض کرو رتن ہی مجھے نہ چھوڑے۔ تمہیں تو معلوم ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"تم چاہو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ تم بغیر اس سے ملے اور کچھ کہے یہاں سے چلی جاؤ اگر اسے علم نہ ہو کہ تم کہاں چلی گئیں تو وہ رفتہ رفتہ تمہیں بھول جائے گا۔ بتاؤ کتنا روپیہ لوگی۔"

تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد وہ راضی ہو گئی۔ لیکن اس کی مجوزہ رقم نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کیونکہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا۔ مگر میں اپنے بچے کو اس کے چنگل سے بچانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اس روپے میں سے جو میری بیوی اور بچے کے نام سے محفوظ تھا، نیلم کی منہ مانگی رقم ادا کر دی۔

——— نیلم چلی گئی!۔

عرصہ دراز بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا میرے سر سے منوں کا بوجھ اُتر گیا ہے۔ میں اس حصولِ آزادی پر اسقدر مسرور تھا کہ مجھے وہ رقم بھی یاد نہ رہی جو میں نے اس کی قیمت میں ادا کی تھی۔ لیکن رتن!! اُس میں تو انقلاب پیدا ہو گیا۔ کہاں کی خوشی اور کیسی شوخی، وہ ہر وقت اُداس رہتا تھا کیونکہ اسے نیلم سے بے غرض محبت تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھ پر سناٹا چھا گیا۔ مگر پھر بھی میں مطمئن تھا کہ میں نے اُسے فریبِ محبت سے بچا لیا ہے۔

جوں جوں وقت گذرتا رہا وہ کام کاج میں حصہ لینے لگا اور کبھی کبھی ہنس بولنے بھی لگا کہ...... نیلم واپس آگئی! ڈیڑھ سال پہلے میں نے اپنی اور اپنے بچے کی آزادی کے لئے دماغ کی دُنیا درہم برہم کر دینے والی رقم اُسے دی تھی مگر وہ پھر بھی واپس آگئی۔ پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار اور خوبصورت!۔

ایک دن رتن کو خلافِ معمول ہشاش بشاش دیکھ کر مجھے بیحد تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اسے کھوئی ہوئی جنت دوبارہ مل گئی ہے مجھے کچھ شبہ ہوا مگر میں نے اپنے دل کو یہ کہکر تسلی دے لی کہ رتن اب نیلم سے مل ہی نہیں سکتا۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا تو اس کے جاتے ہی میں نے اسکی ماں سے گفتگو کرنی چاہی کہ شاید اس کی خوشی کا سبب اُس کو معلوم ہو۔ وہ خاموش تھی، بالکل خاموش گویا کسی روشن شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا گیا ہو۔ میں نے کئی بار اُس سے پوچھا تو کہنے لگی "تمہارے

دفتر میں جو لڑکی نیلم کام کرتی تھی، رتن اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُن دنوں اُس کے مغموم رہنے کی وجہ یہ تھی کہ نیلم کہیں باہر چلی گئی تھی۔ کیونکہ وہ ایک شخص کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو گئی اور چونکہ اُسے رتن سے محبت ہے اِس لئے اُس سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی اور سے شادی کر کے اسی شہر میں رہے۔ کچھ دنوں بعد اُس شخص نے اُس کو طلاق دیدی کیونکہ وہ اُس سے رتن کے ہوتے ہوئے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ پھر واپس آ گئی ہو یہ سب باتیں اُس نے مجھ سے کہی ہیں اور چاہتا ہے کہ ہم دونوں اُسے نیلم کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیدیں۔"

میرا سر چکرانے لگا اور نیلم کی مکاریاں میرے سامنے عُریاں ہو کر شعلوں کی طرح ناچنے لگیں۔ وہ ہمدردی اور محبت کا واسطہ دیکر رتن کو اپنے جال میں پھانسنا چاہتی تھی۔ میں یہ کیسے برداشت کر لیتا؟ میں نے بیوی سے پوچھا "تم نے کیا کہا؟"

"کہتی کیا؟" وہ مایوسی سے بولی "اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے شادی کا مصمم قصد کر چکا ہے۔ میں نے بہتیرا کہا کہ "جس عورت کو طلاق ملی ہوئی ہو وہ ہرگز تیرے لائق نہیں" لیکن وہ یہی کہتا رہا "اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ یہاں واپس ہی میرے لئے آئی ہے۔"

میری نگاہیں اپنی بیوی پر جم گئیں اور اُن میں معصومیت اور مایوسی کی جھلک دیکھکر میری روح تھرّا اٹھی۔ اپنی زندگی کے ہر پہلو —— شرمناک پہلو پر بھی —— غور کر کے آخر کار میں نے ایک فیصلہ کیا۔

۴

دوسرے روز دفتر سے ذرا سویرے اٹھ کر میں سیدھا نیلم کے مکان پر پہونچا۔ وہ مجھے دیکھکر بولی "مجھے تو اُمید نہیں تھی کہ آپ اب کبھی غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائینگے اور......!"

میں نے بات کاٹ کر کہا "کیا تم سمجھتی ہو میں تم کو تمہاری چال میں کامیاب ہونے

دوں گا؟ کیا تم میں شرافت نہیں ہے؟"

"اب تو شرافت پر اتر آئے؟" وہ طنز اور حقارت سے کہنے لگی "تم خود تو تمام عمر مجھے دھوکہ دیتے رہے اور آج شرافت کا سبق پڑھانے آئے ہو اور کہتے ہو کہ میں تمہارے بیٹے کی بیوی بننے کے لائق نہیں ہوں؟ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن میں رتن کے باپ سے زیادہ بُری نہیں ہوں۔ اگر تم میری زندگی خراب کرنے پر ہی تلے ہوئے ہو تو جاؤ۔ جو تم سے ہو سکے کر لو۔ مگر یاد رکھنا وہی انجام تمہارا بھی ہوگا۔"

"خیر!" میں نے جواب دیا۔ "تم نے مجھے اس حالت پر پہونچا دیا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو تمہارے ساتھ شادی سے باز رکھنے کے لئے ہر خمیازے کو بھگت لوں گا۔"

"اونہہ" وہ لاپروائی سے بولی۔ "رتن کے ساتھ میری شادی میں روڑا اٹکانے کا بہت بُرا انجام ہوگا۔"

یکلخت میرا خون کھولنے لگا اور آس پاس کی چیزیں گھومتی ہوئی نظر آنے لگیں آپے سے باہر ہو کر میں نے اُسے پکڑ لیا اور بغیر انجام سوچے اُسے بُری طرح مارنا شروع کیا مجھے نہیں معلوم معاملہ کس طرح ختم ہوتا کہ دفعتاً میری پُشت پر بہت زور سے ایک مُکّا پڑا اور کسی کے مضبوط ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا یکایک میں نے پلٹ کر دیکھا ——— میرا لڑکا میرے سامنے تھا!۔

"ابا!؟" اُس کے منہ سے نکلا "کیا بات ہے؟"

نیلم ایک طرف پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ چند لمحات تک کوئی نہیں بول سکا۔ پھر میرے کانوں میں نیلم کی پر درد اور نحیف آواز آئی۔ "یہ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ نہیں چاہتے کہ میں تم سے شادی کروں۔"

بمشکل تمام میں نے اپنے پر قابو پایا اور اپنے بیٹے کو بے کم و کاست اپنی زندگی کے

تمام شرمناک واقعات سُنا دیئے۔ اِس دوران میں، میں اُسوقت بھی اپنے اور نیلم کے تعلقات کو بیان کرتے ہوئے نہیں جھجکا جب میرے بیٹے کی آنکھوں میں ہراس اور دُکھ کے آثار پیدا ہو گئے۔ اُس کا بُشرہ کہہ رہا تھا "اے باپ! میں یہ کیسے یقین کروں؟"

رتن بالکل بے حس و حرکت رہا۔ میرے ختم کرتے ہی اُس نے خشمناک ہو کر کہا "کیا یہ سچ ہے نیلم؟ جھوٹ نہ بولنا ——— مجھے سب کچھ معلوم ہونا چاہیے"

"ہاں" وہ نہایت اطمینان سے بولی "یہ بالکل صحیح ہے، تمہارا کیا ارادہ ہے؟ یاد رکھو تم میرے قبضے میں ہو"

رتن صدمے اور غصے سے اِسقدر متاثر ہوا کہ فوراً ہی وہاں سے بغیر کچھ کہے چلا گیا اور میں بھی اسکے بعد وہاں سے چلا گیا۔

اُس دِن سے رتن نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ہر وقت ایک بیجان ہستی کی طرح خیالات میں مستغرق رہنے لگا۔

اپنی ماں کو تسلی دینے کے لیئے وہ کہہ دیا تھا کہ طبیعت اچھی نہیں ہے اور جب اُس نے نیلم کے متعلق ایکدفعہ پوچھا تو رتن نے صرف اتنا کہا "ماں! تم سچ کہتی تھیں وہ میرے لائق نہیں ہے" اِسکے علاوہ میرا اُس نے اشارۃً بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔

ایک دن مصیبتوں کی انتہا ہو گئی۔

نیلم نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے ایک ہوشیار وکیل کی معرفت ——— رتن کے خلاف دعوی کر دیا اور الزام یہ لگایا کہ رتن مجھ سے محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اُس سے شادی کر لوں مگر چونکہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اس نے اُس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا۔

میں نے لاکھ کوشش کی کہ تمام واقعات کی اصلیت آشکار کر کے تمام جرم اپنے اوپر لے لوں۔ لیکن ناکام رہا۔ کیونکہ رتن نے میری خاطر ——— اس خیال سے کہ میری بدنامی نہ ہو اور مجھے جیل خانے نہ جانا پڑے ——— سر تا سر اپنے آپ کو مجرم تسلیم کر لیا۔ یہی نیلم کا مقصد بھی تھا۔ وہ رتن کو جیل خانے بھجوا کر مجھے روحانی عذاب میں مبتلا کر کے اپنا انتقام لینا چاہتی تھی۔

میری اور میری بیوی کی تمام ملکیت مقدمے کی نذر ہو گئی۔ لیکن بے قصور رتن پھر بھی قانونی شکنجے سے نہ بچ سکا۔ وہ کسی جیل خانے میں بھیجدیا گیا۔ لیکن اسکی خاموش آنکھیں ——— آہ! وہ بے پناہ آنکھیں اور معصوم چہرہ، زندگی کے آخری سانس تک یادگار رہے گا۔ اُس کی ماں کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ غم اور بدنامی نے اُسکو زندہ درگور کر دیا تھا۔ اسلئے وہ رتن کو سزا ہونے سے پیشتر ہی گھل گھل کر مر گئی۔

بیوی جیتے جی گئی، بیٹا ——— میرے کارن ——— جیل خانے گیا اب میرا نہ کوئی عزیز تھا نہ آشنا، گھر تھا نہ بار۔ ایک دن وہ آیا کہ میرا احساس اور غیرت بھی مُردہ ہو گئی اور میں پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کے ٹکڑے مانگنے گلی گلی پھرنے لگا۔ ہاں میرے دل میں، وحشتناک تاریکی میں ٹمٹمانے والے دیئے کی طرح، ایک آرزو پھر بھی زندہ تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح اپنے بے گناہ بچّے کو، جس نے اپنی زندگی مجھپر بھینٹ چڑھا دی ایک نظر دیکھ لوں۔

اس واقعہ کو برسوں گذر گئے۔ ایک شام پھرتا پھراتا ایک کباڑیئے کی دکان کے سامنے سے گذرا۔ وہاں میرے بچّے کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ دیکھ کر دل بھر آیا۔ طبیعت بے چین ہو گئی، اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آگے بڑھا اور تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے، چند پیسے اُسی روز جمع ہوئے تھے۔ مگر جیبیں پھٹ گئی تھیں اسلئے ایک پیسہ بھی نہ نکل سکا۔ دکان دار کے آگے ہاتھ جوڑے، خوشامد کی۔ مگر وہ دھتکار کر بولا:

او آگے بڑھو، آیا کہیں سے تصویر مانگنے والا! یہ تصویر بہت روپوں کی ہے۔ دیکھتا نہیں چاندی کا فریم ہے۔"

تصویر تو بہر حال میرے بیٹے کی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اُس سے چھین لی۔ اور لیکر بھاگا...... اِس کے آگے جو ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ اب میں یہ سوچتا ہوں نہ جانے رتن کہاں ہے؟ کیا کبھی میں اُس کا مُکھڑا دیکھ سکوں گا؟ کیا وہ اپنے نفس پرست بوڑھے باپ کا قصور معاف کر دے گا؟ اب مجھے مستقبل کا خیال بھی کبھی نہیں آتا۔ لیکن بیتے ہوئے دنوں کی یاد تیرِ نیم کش کی طرح دل میں چبھ کر رہ گئی ہے۔ اور اس کی خلش ہوش کو سکون سے نہیں رہنے دیتی۔

بس صاحب! یہ میری کہانی ہے جو آپ کی ہمدردی نے مجھ سے بیان کروالی۔

۱۹۳۷ء

نیشن ہوس

ڈاکٹر قاسمی نو عمر مگر ہر دلعزیز ہیں - مریض دوا سے زیادہ ، اُن کی خوش اخلاقی اور ہمدردانہ باتوں سے اچھا ہوتا ہے - خدا بھی اُن پر مہربان ہے ، اس لیے اُن کے ہاتھ میں شفا دی ہے - مطب میں ٹھٹ کا ٹھٹ لگا رہتا ہے ، لیکن وہ کبھی اُکتاتے نہیں ، ہر ایک سے جھک کر ملتے ہیں ، چاہے کوئی امیر ہو یا غریب ، بلکہ غریب اُن کے مطب سے کچھ زیادہ ہی لیکر جاتے ہیں - شہر کے تمام گھروں میں اُن کا چرچا ہے - کوئی دُکھ ہو ، کوئی تکلیف ہو ، ڈاکٹر قاسمی کو بلاؤ - اور وہ بھی ایسے بے عذر ہیں کہ دن رات ، بھوک نیند ، آرام ، تفریح ، کسی کی پروا نہیں کرتے - بیگ اُٹھایا اور ضرورت مند کے ہاں بھاگے چلے جا رہے ہیں -

رات بھر بے خواب اور دن بھر مصروف رہنے سے اُن کی آنکھیں سوجھ سی گئی ہیں ، تھکن نے جسم پڑا کر دیا ہے ، جوڑ جوڑ میں ہیکلی سی محسوس ہو رہی ہے - آخر انسان ہی تو ہیں ، بغیر آرام کیے کوئی کیسے جی سکتا ہے - کل رات یکے بعد دیگرے کئی گھروں پر جانا پڑا

کہیں نمونیہ تھا، کہیں نزع کا عالم۔ کوئی سرسام میں مبتلا تھا، کوئی درد سے بیحال کسی کی گود خالی ہو رہی تھی، اور کسی کا سہاگ لٹ رہا تھا۔ پھر مطب میں بہت سے لوگ ٹوٹی ہوئی اُمیدیں جوڑنے آئے تھے اور وہ ہر ایک سے یہی کہتے "کوئی خطرے کی بات نہیں۔ جلد اچھے ہو جاؤ گے"

ڈاکٹری بھی کیسا عجیب و غریب پیشہ ہے۔ ڈاکٹر بن کر، انسان ہر قسم کی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے۔ نہ دن اُس کا، نہ رات اُس کی، مزید براں یہ جانتے ہوئے بھی کہ فلاں مریض کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں، اُسے کہنا یہی پڑتا ہے کہ بچ جائیگا۔ اُسے زندگی کی مجبوریوں اور موت کی چیرہ دستیوں کو کتنے نزدیک سے دیکھنا پڑتا ہے۔ گویا اُسی کے سینے پر تیر چل رہے ہوں۔ لیکن وہ منہ سے اُف تک نہیں کر سکتا۔

دوپہر کو اُسے ایک مریضہ کے ہاں جانا پڑا۔ در و دیوار پر مایوسی اور حسرت برس رہی تھی۔ چاروں طرف عزیز و اقربا پتھر کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ایک طرف سے ایک کمسن بچّے کے بلکنے کی آواز آئی، سامنے مریضہ کا شوہر اشکبار آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اِن نظروں میں اُس نے کیا کچھ پڑھا؟ وہی جو ہر ڈاکٹر کو اپنی عمر میں ایک نہ ایک دفعہ ضرور پڑھنا پڑتا ہے۔ وہ نگاہیں کہہ رہی تھیں "اب ساری اُمیدیں تم ہی سے وابستہ ہیں۔ ہماری دعائیں ختم ہوئیں، خدا بہرہ ہو گیا ہے" گویا یہ انسان، مریض جیسا آب و گِل کا پُتلا، خاکم بدہن، خدا سے ——— جو چاہے تو تنکے میں جان ڈال سکتا ہے ——— بہتر ہے، اور یا شاید دونوں نے اپنی اپنی صفات کم از کم اس وقت ایک دوسرے سے بدل لی ہیں! آپ اسے کفر کہہ لیجئے۔ مگر انسانی سرشت (کمزوری؟) کو تو نہیں بدل سکتے! اُس نے سوچا "کاش میں ڈاکٹر نہ ہوتا! میں کیسے جھوٹ بول دوں کہ موت کے منہ سے بچا لوں گا؟" انسانی فراست اتنی وسیع تو نہیں کہ ہر جگہ ٹکرانے کی سکت ہو۔

مگر نہیں، وہ ڈاکٹر ہے، دل میں چاہے جو کچھ سوچے، ذہن میں خواہ کیسی ہی بغاوت ہو، زبان سے وہ اپنی بے بسی اور مجبوری ظاہر نہیں کر سکتا۔ اُسے مسیحائی کا دعویٰ کرنا ہی پڑے گا......

۱۵

دن ڈھلے خدا خدا کر کے اُسے مہلت ملی اور وہ گھر آ کر سیدھا اپنے کمرہ میں چلا گیا، کہ ذرا کمر سیدھی کر لے۔ فوراً ہی اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ دنیا اور اس کی الجھنوں سے غافل ہو کر خواب دیکھنے لگا —— خواب، حسن و محبت کا، شباب و آرزوں کا، فیروزہ اور اُس کی رعنائی کا۔

فیروزہ ڈاکٹر قاسمی کی دور پرے کی رشتہ دار اور کالج کی طالب علم ہے، لیکن تعلیم اور آزادی نے اُسے بیباک نہیں کیا۔ وہ صحیح معنوں میں چراغ خانہ ہے اور سوائے قاسمی کے کسی اور مرد کا تخیّل بھول کر بھی اُس کے ذہن میں نہیں آتا۔ وہ بھی اُس پر سو جان سے فدا ہے۔ اُس کے خد و خال، ناک نقشہ، گہری بھوری آنکھیں، سیاہ چمکدار بال اُس کی رگ رگ میں سمائے ہوئے ہیں۔ اتنا تعلق ہونے پر بھی وہ دونوں ابھی محبت کے بے پناہ طوفان سے واقف نہیں، اُن کا جذبۂ شوق ہولے ہولے بہنے والے آبشار کی طرح ہے۔ جس کی ترنم ریز روانی میں بے غرض محبت اور بےفکر جینے کا مزا ملتا ہے اُن کی نسبت ہو چکی ہے اور وہ وقت زیادہ دور نہیں جب اُن کو ازدواج کی سچی مسرتیں مل جائیں گی —— وہ خواب دیکھ رہا تھا کہ کسی نامعلوم مقام پر جہاں کا ذرہ ذرہ حسن و رعنائی سے منور ہے، وہ دونوں انگور کی بیلوں کے سایے میں بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ اُن کا موضوع اور مفہوم کیا ہے، یہ وہ نہیں جانتا۔ البتہ آپ ہی آپ، اُس نے فیروزہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ان کو لبوں سے لگا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ خواب کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلۂ لامتناہی بن جائے، مگر حقیقت

کی دنیا سے کون بچ سکتا ہے ؟ وہ خوابناک فردوس، آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور وہ یہیں، اسی جیتی جاگتی دُنیا میں واپس آ رہا تھا۔

اُس نے آنکھیں کھولیں، پھر بند کر لیں۔ یہ کیا ؟ اُسے یقین نہ آیا، اُس کے ہاتھوں میں واقعی گوری گوری کلائیاں تھیں مگر فیروزہ کی نہیں، بلکہ ——— بلکہ اُس کے بھائی کی اینگلو انڈین بیوی کی !۔

فرآن اُس کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سُنہرے بال قریب قریب اُس کے چہرے سے مَس ہو رہے تھے۔ اس کا لباس مختصر تھا۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی چھت پر سے آفتابی غسل کر کے آئی تھی۔ اس کے مجلّا جسم، بھینی بھینی خوشبو اور حُسن و شباب کے اسقدر قرب نے اُسے چونکا دیا، گویا وہ فرآن کو آج پہلی دفعہ دیکھ رہا ہے۔ وہ یہاں کئی ماہ سے مقیم ہے۔ مگر اُس نے آج تک اُسے نگاہ بھر کر نہ دیکھا، جیسے وہ عورت ہی نہیں ہے، جس کے قدم قدم پر نسوانی لطافتیں اور شبابی رنگینیاں قربان ہوتی ہیں۔ اُس کے نزدیک وہ صرف اُس کے بھائی کی بیوی ہے۔ ایک ایسی ہستی، جسپر اُس کے بھائی کی زندگی کا انحصار ہے، جو اُس کے بھائی کو دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس کی ایک ہلکی سی مُسکراہٹ دیکھ کر، زاہدی کی تباہ حال زندگی میں ایک لمحے کے لئے سکون آجاتا ہے۔

اپنے بڑے بھائی کا خیال آتے ہی اُس نے فوراً فرآن کے ہاتھ، جو بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح جل رہے تھے، آہستہ سے پرے ہٹا دیئے۔ بیشک زاہدی قطعی شکی نہیں ہے، لیکن فرآن کا اس نیم برہنگی میں اُس کے پاس کیا کام ؟ دفعتاً اُس کی نگاہیں گھڑی پر جم گئیں جو کارنس پر رکھی ہوئی ٹِک ٹِک کئے جا رہی تھی۔ زاہدی بالعموم پانچ بجے اپنے دفتر سے واپس آتا ہے اور گھر میں داخل ہو کر اُس کی نگاہیں سب سے پہلے اپنی محبوب بیوی کو ڈھونڈتی ہیں، جس سے اُسے بے پناہ محبت ہے۔ قاسمی کو معلوم ہے کہ فرآن کو دیکھ دیکھ کر ہی زاہدی جی رہا ہے، ورنہ قسمت کی اس گردش

سے جوان ان کو ایک ہی دفعہ میں پسپ کر رکھ دیتی ہے، وہ کہاں پنپتا؟
فراز، قاسمی کے خیالات کو سمجھ گئی۔ اُس کی بیتاب آنکھوں میں غصّہ سا چمکنے لگا۔ اور اسکے احمریں لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "زاہدی کے آنے میں ابھی دیر ہے"، اُس نے بیصبری سے کہا۔ "مجھے اُنہی کے متعلق گفتگو کرنی ہے اور میں اسی لئے تمہارا دروازہ کھلا دیکھکر چلی آئی۔ کہ تم سے تنہائی میں گفتگو کر سکوں"۔

اُس نے قاسمی پر سے اپنی نگاہیں ہٹالیں۔ اور ذرا ٹھیر کر کہنے لگی۔ "قاسمی! تم ڈاکٹر ہو! مجھے تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہیئے۔ تم اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتے ہو کہ اُن کا شباب اور اُمنگیں ختم ہو چکی ہیں۔ آہ! میں تم سے کس طرح کہوں۔ تم تو انکار ہی کروگے، تمہارا کام ہی بہانہ سازی اور دھوکہ میں رکھنا ہے۔ تم نے اُنہیں مغالطے میں ڈال رکھا ہے کہ انسولین کے انجکشن اُنہیں فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ تم اِس سے بھی انجان بنے رہتے ہو کہ اب اُن کی حیثیت محض ایک منشی کی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں۔ اور صرف تمہارے ہی روپے سے یہ گھر چل رہا ہے، مگر تم کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے اچھا ہے، سب دھوکے میں رہیں! سبکو مغالطہ رہے! سب انجان بنیں!"

پھر وہ کھڑی ہو گئی اور ایک حواس باختہ عورت کی طرح کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ "لیکن میں اب کسی مغالطے میں نہیں رہنا چاہتی۔ میرے جذبات تو آخر سرد نہیں ہو گئے!۔ اب اُن سے میرا نباہ ممکن نہیں"۔

قاسمی حیران نہیں ہوا۔ اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ زاہدی کی مست شباب بیوی اب اپنے شوہر کے ساتھ مسرور نہیں رہ سکتی۔ اُس کے سُرخ ہونٹوں کی بیتاب جنبش، اُس کی بیقرار چال ڈھال۔ زاہدی کے ساتھ بے دلی سے گفتگو اور گلابی مکھڑے کے اُتار چڑھاؤ سے بہ آسانی پتہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسکو اطمینان و سکون نہیں ہے۔ یکایک قاسمی کے دل میں رحم اور خوف کا سمندر اُمنڈ آیا —— آہ، اُس کا

بے چارہ بھائی! وہ اس خیال سے گُم سُم ہو گیا کہ زاہدی نے اس کے لئے کیا کیا قربانیاں کی ہیں اور خود وہ بھی تو اسے بیحد چاہتا ہے۔

قاسمی سے بولا نہیں گیا، اُس نے بمشکل کوشش کی "آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ بھائی جان آپ ہی کی وجہ سے جی رہے ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کو اُن سے محبت نہیں ہے تو دنیا اُن کی آنکھوں میں اندھیر ہو جائیگی"

فرآن کے چہرے سے طوفانی اور اضطرابی آثار معدوم ہو گئے۔ وہ آپے میں آگئی اور اُس کے پلنگ پہ بیٹھ کر نرم لہجے میں کہنے لگی "میں سنگدل نہیں ہوں قاسمی! تمہاری طرح مجھے بھی اُن پر رحم آتا ہے۔ بولو، کیا میں نے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی کی ہے؟ قاسمی! سُنو ــــــ"

اُس کی منوّر آنکھوں میں پھر جلال آگیا۔ اور اُس کی آواز پھر کسی ہسٹریا کی مریضہ کی طرح کرخت ہو گئی "قاسمی! تمہیں کیا معلوم۔ رات رات بھر تمہارے تصور میں محو ہو کر مجھ پر کیا بیتتی ہے۔ آہ! جب ساری دنیا پڑی سوتی ہے، میں پہروں تمہارے لئے روتی ہوں...... نہیں نہیں مجھے اِس طرح نہ گھورو۔ میں اب حقیقت نہیں چھپا سکتی تم آنکھوں پر پٹی باندھے رہے اور یہ نہ دیکھ سکے کہ جب سے تم نے اس گھر میں قدم رکھا، تم نے مجھے اپنی محبت میں مبتلا کر کے آتش زیرِ پا کر دیا ہے"

قاسمی کو ایسا معلوم ہوا کہ اُس کا چہرہ ستّ گیا ہے، پیشانی پر سرد پسینہ کے قطرے نمودار ہو گئے "فرآن" اُس نے خشمناک ہو کر کہا "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ ایسی لغو باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"لیکن میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ سچ ہے، قاسمی! میں یہ نہیں کہتی کہ تم زاہدی کو کوئی دکھ پہنچاؤ۔ اُنہیں کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ میں اب صرف اسی صورت میں اُن کے ساتھ اپنی زندگی گذار سکتی ہوں کہ تم مجھ سے بے رُخی سے پیش نہ آؤ ــــــ

زاہدی کو کبھی خبر نہ ہوگی، اور اس طرح وہ کبھی غم آشنا نہ ہوگا۔" اُس نے شکستہ سانسوں میں کہا اور یکبارگی اپنی خوشبودار عریاں باہیں اسکی گردن میں حمائل کردیں۔

دونوں نے ایک ساتھ سُنا کہ ——— دروازہ کھلا اور زاہدی کے قدموں کی آواز آئی۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے کھڑی ہوگئی اور اس کے سینے کا زیر و بم اُس کے روحانی انتشار کا انکشاف کرنے لگا۔ اُس نے ایک سیکنڈ کے لئے قاسمی پر اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی کہ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا ہے اور خاموشی سے وہاں سے نکلکر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے نظروں سے اوجھل ہوئے ایک ہی لمحہ ہوا ہوگا کہ زاہدی سامنے آکھڑا ہوا اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

اُس کی مسکراہٹ ہے جیسے، وہ قدرت کی ستم ظریفی پر ایک طنزِ لطیف ہے۔ اُس کے ماتھے پر قبل از وقت انحطاط کے نقوش نمایاں ہوگئے ہیں اور آنکھیں تھکی ہوئی روح کی طرح بے رونق ہیں۔ اُس کی کمر میں خم آچلا ہے۔ اور کندھے تو گویا بارِ حیات سے دُوہرے ہوگئے ہیں اور چہرہ ہے جیسے، اُس کے جان لیوا مرض نے اُسپر تباہیوں اور ویرانیوں کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

اُس نے مسکراتے ہوئے پیار کے لہجہ میں تادیب کی " ارے! اتنا بڑا ڈاکٹر اور آرام کر رہا ہے!؟۔ جانے کتنے مریض صرف اس اُمید میں موت سے کشمکش کر رہے ہوں گے کہ قاسمی آکر بچالے!!"

۲

زاہدی قاسمی کو بڑا ماہر ڈاکٹر سمجھتا ہے اور اُس کے خیال میں وہ لوگ نہایت ناسمجھ ہیں جو اپنی صحت اور زندگی کے لئے اُس سے رجوع نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُس کو اب بھی بچہ سمجھتا ہے اُتنا ہی بڑا، جتنا ماں باپ نے دس پندرہ سال

پہلے چھوڑا اور اُس نے اُس کی پرورش اور تربیت کا بار اپنے سر پر اُٹھایا۔ قاسمی کو سب اگلی پچھلی باتیں یاد آگئیں۔ اپنی بڑی سے بڑی مصروفیت اور سخت سے سخت تشویش میں بھی، زاہدی اُس کو کبھی نہیں بھولا اور روپے کو پانی کی طرح بہا کر اُس کو اس قابل کیا کہ آج بہت سے لوگ زندگی کے لئے اُس کی صورت تکتے ہیں۔ اُسی کے روپے، محبت، اور حوصلہ افزائی سے وہ آج اتنا بڑا اور مقبول ڈاکٹر ہے۔ ورنہ یہ عزت اور افتخار اُسے کہاں نصیب ہوتا!۔

لیکن دائمی مسرت کسی کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ زاہدی ایک زمانے میں ہزاروں لاکھوں کا آدمی تھا، کلکتہ ہی میں اُس نے قرآن سے شادی کی تھی اور ہنسی خوشی دن بسر ہوتے تھے، مگر اچانک کام بگڑا، کاروبار بیٹھ گیا اور منہ چھپانے کے لئے اس چھوٹے سے شہر میں آکر ایک دفتر میں معمولی مشاہرے پر نوکری کرنی پڑی ستم پر ستم یہ ہوا کہ اسے ذیابیطس کا جو مرض لاحق تھا، اُس نے یہاں زور پکڑا، ساری جسمانی طاقت ضائع اور ہمت پست ہوگئی۔ قاسمی کو اس کے مرض کا علم نہیں تھا۔ اب معلوم ہوا تو اُس کا دل نہ مانا کہ ایسے وقت، جب بھائی کو اس کی ضرورت ہے وہ کہیں اور پریکٹس کرے۔ مزید براں قلیل آمدنی میں زاہدی کا گذارہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بھائی کے پاس ہی آگیا اور یہیں ڈاکٹری شروع کردی۔ اُسے ہردم اپنے بھائی کی صحت بحال کرنے کا خیال لگا رہتا اور وہ اُسے ہر وہ ممکن دوا استعمال اور احتیاط کراتا رہتا جو ایسے مریض کے لئے ضروری ہے۔ تین سال کی بیماری نے زاہدی کو کہیں کا نہ رکھا، بس وہ دیکھنے میں زندہ معلوم ہوتا ہے ورنہ اُس کا دل اور دل کی تمام اُمنگیں مرچکی ہیں، اور سب سے زیادہ، گذرے ہوئے زمانے کی یاد اُس کے لئے سوہانِ روح ہے۔ اُس کی بے فکری اور تموّل ختم ہوگیا ہے، اب صرف عہدِ ماضی کی ایک یادگار باقی ہے، اور وہ ہے شباب

کی سرمستیوں سے بھرپور حسین وجمیل بیوی!۔

اُس کا مقصود محض اپنے بھائی کی مدد کرنا تھا ——— اُس بھائی کی جس نے اُس کی زندگی اور مستقبل بنایا۔ اُس کی بیوی پر نگاہ اٹھانا بھی اُس کے لئے حرام اور حد درجہ شرمناک تھا، لیکن وہ کیا کرتا؟ فرآن کی باتوں اور گھناؤنی تجویز نے اُس کی حسیات اور خیالات کو مفلوج کر دیا۔ اُس کے قرب اور اسقدر بے تکلفی سے اُس کے دل کی دھڑکن اب بھی تیز تھی، اور وہ پڑا سوچ رہا تھا، کاش یہ سب کچھ صرف ایک پریشان خواب ہوتا! وہ اس کمرہ میں نہ آتی! اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نہ نکلتے!۔

لیکن اب کیا ہو؟ یہ سب تو سچ مچ ہوا تھا۔ فرآن کی جنونی محبت کی اُسے بالکل پروا نہیں تھی، مگر اپنی جگہ یہ بڑی اہمیت رکھتی تھی، کیا خبر اِسی کی بدولت اُن کا بھرا پُرا گھر تہس نہس ہو جائے۔ اُس کے لیے ایک راہ کھلی ہوئی تھی۔ یہ کہ، وہ اسی وقت اپنا بوریا بستر باندھ کر یہاں سے چلا جائے ——— لیکن وہ ایسے آڑے وقت اپنے بھائی کو، جو اُسے اولاد کی طرح جان چھڑکتا ہے، کیسے چھوڑ دے؟ گھر سے نکلنے کی وہ کوئی وجہ بھی تو نہیں بتا سکتا اور کون جانے اُس کے چلے جانے سے فرآن کے تن بدن میں آگ لگ جائے۔ اور وہ ضد میں آ کر زاہدی سے اپنے دل کا بھید کہہ دے پھر تو غضب ہی ہو جائیگا۔ زاہدی یہ اچانک صدمہ کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اُس کا دل توڑ دینے سے پہلے، وہ ہی سب بلا اپنے سر نہ لے لے؟۔

کوئی صورت نہ نکل سکی، آخر اُسے وہیں رہنا پڑا۔ البتہ کام کے بہانے سے وہ زیادہ تر وقت باہر گذارتا اور صرف اپنے بھائی کی موجودگی میں گھر آتا، اور جب کبھی اُس کی فرآن سے نگاہیں ملتیں تو وہ دیکھتا کہ اُن میں تمسخر اور تفنن ناچ رہے ہیں۔ وہ اُس سے حتی المقدور احتراز کرتا، گویا وہ کوئی کوڑھی ہے، مگر جب وہ سامنے پڑ جاتی تو اُس کا دل سینہ میں دھڑکنے لگتا۔

اُس کے الگ الگ سے رہنے کو زاہدی نے بڑی طرح محسوس کیا اور ایک روز اُس سے تنہائی میں کہنے لگا۔ "قاسمی! معلوم نہیں کیا بات ہے ...... تم فرآن سے کھنچے سے رہتے ہو۔ اُن کو تمہاری بے رُخی کی شکایت ہے۔ حالانکہ میں نے اُن سے کہدیا ہے کہ آجکل مریضوں کا زور ہے۔ تم تھوڑی دیر اُن کے پاس ضرور بیٹھا کرو، کیونکہ تمہیں اپنا بھائی سمجھتی ہیں۔ اور میری طرح اُنہیں بھی تم سے بہت محبت ہے۔

اُس نے ہنس کر بات اُڑا دی، لیکن اُسے معلوم تھا کہ فرآن کیا چاہتی ہے!

آہ! بچارا زاہدی!۔

مطب سے فارغ ہو کر وہ گھر میں داخل ہوا تو زاہدی نے فوراً پکارا۔ "قاسمی! قاسمی! یہاں آنا" اُس کی آواز میں اُس وقت خلافِ معمول خوشی جھلک رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ آج زاہدی کے چہرے پر بڑی رونق ہے اور اُس کے گڑھے پڑے ہوئے رخساروں پہ سُرخی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ زاہدی نے اُسے بتایا کہ دفتر والے اسے ایک کام سے کلکتہ بھیج رہے ہیں اور اگر وہ کام ہو گیا تو اُس کو بہت فائدہ پہنچے گا ——— پھر وہ معمولی منشی نہیں رہے گا! اُسے اتنا کچھ مل جائے گا کہ یہ دن بھر کی ریں ریں، افسروں کی جھڑکیاں، کمتری کا احساس اور بدحالی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی۔ اُسے مستقبل کے جھروکے سے سہانے خواب نظر آ رہے تھے، قاسمی کے شانے کو پیار سے دباتے ہوئے اُس کی آنکھیں اطمینان و مسرت سے چمک اُٹھیں۔ پھر اُس نے فرآن کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

"لیکن فرآن! تم اکیلی رہو گی۔ میں نے تمہیں آج تک شب بھر کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑا، مگر اب ......"

فرآن بات کاٹ کر بولی "فکر کی کیا بات ہے۔ میں گھر میں بالکل اکیلی تو نہیں ہوں۔ قاسمی جو یہاں ہیں۔"

زاہدی نے قاسمی کو دیکھا۔" ہاں۔ تم ان کا خیال رکھنا۔ تمہارے ہی بھروسے یہاں کو چھوڑ کر جاتا ہوں۔"

جیسے کسی نے اسے سُن کر دیا ہو۔ زاہدی کے لہجے میں اعتماد اور فرآن کے پرتمسخر الفاظ نے اس کا خون رگوں میں جما دیا۔

دوسرے روز، شام کو زاہدی کے جانے کے بعد، اُس نے تہیہ کرلیا کہ وہ رات کو گھر ہرگز نہیں آئیگا۔ زاہدی کی، اس کی، اور اس گھر کی بہتری اسی میں ہے۔ ورنہ زاہدی کی زندگی اور اسکی مسرت ہمیشہ کے لئے اُجڑ جائے گی۔ قاسمی اسکی دیکھ بھال ہی کیا کرے گا؟ وہ کوئی بچّہ تو ہے نہیں کہ اس کی خبر گیری کی جائے۔ بعد میں جب زاہدی واپس آئے گا تو وہ کہہ سکتا ہے کہ کسی بڑے آدمی کے علاج کے لئے باہر جانا پڑا۔

رات کا کھانا اُس نے ہوٹل میں کھایا اور رات گئے وہ مطب ہی میں آکر اسٹریچر پر لیٹ گیا۔ فرآن نے اُسے جس کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا، رفتہ رفتہ اسکی کوفت دُور ہوگئی اور وہ فیروزہ کی موہنی صورت کا تصور کرتے ہوئے محوِ خواب ہوگیا ——— دفعتاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ کاش اُس نے ریسیور نہ اُٹھایا ہوتا۔ مگر نہیں، یہ ڈاکٹر کے اخلاق کے خلاف ہے۔ اُس نے سُنا، فرآن کی نحیف، مگر طنزیہ آواز آئی۔" مجھے یقین تھا کہ تم یہیں ہوگے! لیکن کیوں؟ اِس گھر میں بھی تمہارے لئے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے تو تم سے گھن آتی ہے۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں! بلکہ اب مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ تم میری نظروں کے سامنے آؤ .... میں نے تمہیں ٹیلیفون یہ اطلاع کرنے کے لئے کیا ہے کہ میں اپنا اسباب باندھ چکی ہوں اور ابھی! اسی وقت، یہاں سے اسپتال جا رہی ہوں۔ زاہدی جب آئیں تو اُن سے

کہدینا کہ میں طلاق چاہتی ہوں ـــــــــــ بس!"

اُس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔" فرآن" اُس نے چیخ کر کہا۔" ٹھیرو، میں آرہا ہوں" مگر ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

وہ تیز گامی سے گھر چلا جا رہا تھا۔ اگر فرآن واقعی چلی گئی تو زاہدی پر کیا کچھ بیت جائیگی تخیل میں اس کا مایوس و نامراد چہرہ دیکھ کر وہ کانپ اٹھا۔ بیشک جب وہ واپسی پر سُنے گا کہ اس کی محبوب بیوی جو اس کی کل کائنات حیات ہے، اسے چھوڑ کر چلی گئی تو جو اس کی بے بسی اور بیچارگی اس سے نہیں دیکھی جائیگی۔ جس طرح بھی ہو اُسے فرآن کو روکنا چاہیئے۔

وہ ابھی گھر میں موجود تھی۔ ایکا ایکی اُس نے اُسے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھوں میں تنفّر اور حقارت کے چشمے اُبل پڑے" ڈاکٹر قاسمی! ایسے ناوقت تم اِس گھر میں کیسے چلے آئے؟ وہ تمہارا نظریۂ پاکیزگی کیا ہوا؟ خیر، میری ہی بیوقوفی تھی کہ محبت میں اندھی ہو کر میں نے سمجھا کہ تم ہی میرے ارمانوں کے مرکز ہو!"

پھر اُس نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔" تم! ـــــــــــ مرد ہو؟ توبہ کرو۔ تم تو ڈاکٹری کی ایک چلتی پھرتی کتاب ہو اور تمہاری رگوں میں بجائے خون کے اِندادی دوائیں بھری ہوئی ہیں" وہ بات کاٹ کر بولا" تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم ایک ایسے شخص کو، جس کی زندگی اور مسرت کا تمامتر انحصار تم پر ہے، زندہ درگور نہ کرو۔ تمہیں اسوقت یہاں سے جانے کا قصد نہیں کرنا چاہیئے۔ میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا"

قاسمی کی باتوں نے اُس کے غصّہ پر تیل کا کام کیا اور وہ آپے سے باہر ہو کر بولی" تم مجھے نہیں جانے دوگے!؟ تم؟ گدھے! پاگل! تمہاری حقیقت کیا ہے؟ میں ابھی جاتی ہوں، اپنے راہب بھیا سے کہدینا کہ میں اب کبھی اس مکان میں قدم

نہیں رکھوں گی۔"

اُس نے ٹیکسی منگانے کے لئے ٹیلیفون اُٹھانا چاہا، قاسمی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ فرآن کے تیور بگڑ گئے۔ "بدتمیز! بیہودہ!!"

"سنو فرآن! میری بات سنو۔"

"بس، اب کوئی بات نہیں سن سکتی۔" ٹیلیفون ہاتھ میں نہ آنے سے اُس پر بھوت سوار ہو گیا۔ اُس نے اس کی ٹانگوں پر ٹھوکر ماری اور چہرے پر ایک تھپیڑ رسید کیا، قاسمی نے اسے اپنے قابو میں کرنے کی کئی بار کوشش کی۔ مگر وہ ہر ہر بار اُس کی گرفت سے نکل جاتی تھی۔ آخر قاسمی نے اُسے دھکا دیدیا تو وہ اور بھی آپے سے بے آپے ہو گئی۔ اُس نے فوراً پیتل کا وزنی گلدان اُٹھا لیا اور ہنکار کر کہنے لگی۔ "میں تجھے جان سے مار ڈالوں گی۔ کمینہ کہیں کا۔"

اُس نے گلدان کھینچ مارا، روشنی گل ہو گئی اور قاسمی کی کنپٹی سے جیتا جیتا خون بہہ نکلا۔ ضرب کی جھنجناہٹ کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی ——— فرآن نے پھر گلدان اُٹھایا اور اپنے خشم وجنون میں پھر مارنے چلی۔ اب کوئی چارہ نہیں تھا، چنانچہ قاسمی نے دونوں ہاتھوں سے اُسے زور سے دھکا دیدیا۔

——— کوئی چیخ نہیں نکلی۔ کوئی سسکی نہیں سنائی دی۔ وہ بے حس و حرکت فرش پر گر پڑی اور موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ اندھیرے اور خاموشی نے مل جُل کر فضا کو ہولناک بنا دیا، بس قاسمی کے بھاری بھاری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ معاً اُس کے دل میں ایک خوف پیدا ہوا کہ کہیں اس کے دل پر تو دھچکا نہیں بیٹھ گیا؟ دماغ میں تو چوٹ نہیں آئی! اے خدا! یہ کیا ہوا؟

"فرآن! فرآن!" وہ بے اختیار ہو کر چیخا۔

اُسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ اُس کے ساکت وجامد جسم پر گر پڑا۔ گھبرا کر اس نے

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کا دل ٹٹولا اور فرآن نے بجلی کی طرح اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

"مجھے معاف کر دو، قاسمی! مجھے معاف کر دو!" اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں پاگل ہو گئی تھی، میرا مقصد تمہیں ضرب پہنچانا نہیں تھا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں چاہتی ہوں، میرے قاسمی! مجھ سے بے رخی سے پیش نہ آؤ، پھر میں زاہدی کو ساری عمر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ سُنا قاسمی! میرے پیارے! مجھے تم سے محبت ہے"۔۔۔۔۔۔۔

کارنس پر ایک گھڑی زندگی کے نظام کی طرح باقاعدہ ٹِک ٹِک ہلکی ٹِک ٹِک کئے جا رہی تھی اور دُور بہت دُور، آسمان کے مشرقی گوشے میں سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ یہ اُس نے کیا کیا؟ اُس کے دماغی ہیجان اور جذبات کی ہل چل نے اُسے بے قابو کیوں کر دیا؟ کوئی یہ سوال کیوں کرے؟ بھلا فرآن جیسی حسین و جمیل عورت کے اسقدر قریب ہونے سے کیوں نہ اُسکے جذبات برانگیختہ ہو جاتے؟ اُس کی رگ و پے میں شعلے بھڑک اُٹھے، اُس کے جسم و جان میں چنگاریاں دہکنے لگیں، اُس کے رُوئیں رُوئیں میں جذبات و شوق کا طوفان بپا ہو گیا۔

زاہدی واپس آیا اور تقدیر کی تحریر کے مطابق اُسے اس کام میں بھی ناکامی ہوئی جس نے اُس کی صحت پر بڑا بُرا اثر کیا۔ اُس کا چہرہ قبرستان کی طرح اُجاڑ اور کندھے کمان کی مانند دوہرے ہوئے، گویا اسپر کئی سال اور بیت گئے ہیں۔ اپنی ناکامی کا واقعہ سناتے ہوئے، اُس نے قاسمی سے آخر میں چند ایسے دلریش الفاظ کہے جن کے حرف حرف سے اس کی برادرانہ چاہت اور اُسپر کلی اعتماد کا پتہ چلتا تھا ——— قاسمی کا ضمیر اُسے لعنت ملامت کرنے لگا۔

فرآن میں یکایک "سحر کُن" تبدیلی رونما ہو گئی، اُسکے تمام جذبات سرد پڑ گئے ہیں وہ اب خاموش، مفتوح، اور مطیع معلوم ہوتی تھی۔ اور جہاں تک ہوتا، قاسمی کی نگاہوں کے سامنے نہ پڑتی۔

قاسمی کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ فیروزہ سے بات کرتے اُسے جھجک ہونے لگی، گویا وہ کوئی سنگین مجرم ہے۔ پھر اُس نے اس کے گھر بھی آنا جانا بہت کم کر دیا۔ آخر اُس میں یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ فیروزہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، بلکہ اُس کی سرد مہری نے اُس کے چراغ محبت کی لَو لَہرا دی۔ قاسمی سے الگ رہ کر تو اُس کی زندگی اَجیرن ہو جائیگی۔

ایک روز وہ بہت عرصہ بعد فیروزہ کے گھر آیا۔ اور سب سے مل ملا کر الگ ہی الگ جانے لگا۔ وہ روٹھی سی ہو گئی اور خود ہمت کر کے اُس نے اُسے اپنے کمرہ میں بُلایا۔ دونوں بُت بنے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر اس کی آنکھوں کو پرنم دیکھکر، قاسمی نے نیچی گردن کر لی۔

"للہ مجھے آپ بتا دیجئے" فیروزہ سے اپنی محبت کی دُنیا یوں اُجڑتے دیکھکر ضبط نہ ہو سکا۔ "آپ چپ چُپ سے کیوں رہتے ہیں؟ آپ کی خاموشی کا کیا مطلب ہے؟ جس نے میرے صبر و حواس کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ کیا میں وہی فیروزہ نہیں رہی جسے آپ ——— ؟"

قاسمی نے آہستہ آہستہ پُرحسرت لہجے میں جواب دیا "بس کرو فیروزہ! میرے دل پر تیر نہ چلاؤ۔ میری خاموشی میری ہی تباہی کا مرثیہ ہے۔ آہ! میں تمہارے لائق نہیں ہوں ———"

اُس نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھکر اُسے خاموش کر دیا "آپ کے منہ سے یہ کیسی باتیں نکل رہی ہیں؟ شاید میں ہی گُھن کھائی ہوں، جب ہی آپ مجھ سے بیزار ہیں؟"

"نہیں، فیروزہ" اُس نے ہولے ہولے کہا۔ "تمہیں یہ خیال بھول کر بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ تم خوبصورت ہو اور ایک لمحہ کے لئے بھی تم میرے دل سے محو نہیں ہوتیں ـــــــ"

"کیا مجھ سے کوئی قصور ہوا ہے؟"

"نہیں تو ـــــــ"

"آپ مجھ سے بیزار تو نہیں؟"

"ارے!؟"

"تو کیا آپ مجھ سے پہلے ہی کی طرح ـــــــ؟"

"ہاں ـــــــ"

اُس کی زبان پر بات آتے آتے رہ گئی۔ اُس نے اپنے پر قابو پالیا۔ بیت گئی سو بیت گئی۔ اُس نے اُسے سرتاپا دیکھا اور اس کا معصوم حسن اپنے روئیں روئیں میں سماتا محسوس کیا۔ بیشک وہی اُس کے خلجان کو سکون آشنا کرسکتی ہے۔

"اور یہ جو سب لوگ کہہ رہے ہیں ـــــــ؟" فیروزہ مسکراتے ہوئے شرما کر بولی۔ اُس کے گلابی رخساروں پر مسرت دمکنے لگی۔ "آپ راضی ہیں نا؟"

"ہاں" اُس گھڑی کا خیال کرکے، جب وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے، اُس کے لبوں پر بھی جوابًا مسکراہٹ آگئی۔

۳

فرآن بے دھڑک مطلب پر آگئی اور قاسمی سے بغیر جھجکے کہنے لگی۔ "میں ماں بننے والی ہوں۔"

اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اُس نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا گویا چمن کا کوئی آزاد پنچھی قفس کی تیلیوں میں سے نکل بھاگنے کے لئے کھڑکی کی تلاش کر رہا ہے۔

"سچ؟" اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "تو تمہیں اور بھائی کو تو بہت خوشی ہوگی"
اُس کی مسکراہٹ طنز میں بجھی ہوئی تھی۔ "قاسمی! تم چھنگو بہت ہو! ابھی تو بچے ہونا! آخر اس بننے سے فائدہ؟ - بچہ زاہدی کا نہیں ہے، اور اسے تم سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ - بولو کیا ارادہ ہے؟"

اُس کو پسینے چھوٹ گئے۔ "یعنی؟" اُس نے اپنے شانوں کو لاپرواہی سے جنبش دی۔

"یعنی کیا؟ تم ڈاکٹر ہو، اسپر اچھی طرح غور کرلو مجھے کسی کی پروا نہیں میں تو اس زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔"

فرآن نے زاہدی سے بھی کہدیا اور یہ خبر اس کے لئے مژدۂ جانفزا ثابت ہوئی۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ دنیا بھر میں اُس سے زیادہ کوئی خوش قسمت نہیں ہے۔ وہ اپنی تباہ حالی کو عارضی طور پر بھول گیا اور اس خیال نے اس کے دل میں جگہ پائی کہ اسکی صحت و تقدیر کے پھر سے اچھے دن آگئے ہیں۔

"خدا کرے لڑکا ہو!" اُس نے مسرت سے بے قابو ہو کر قاسمی سے کہا۔ "میں اُسے بھی ڈاکٹری پڑھواؤں گا۔ تاکہ وہ اپنے چچا کی طرح نامور ہو اور خلقِ خدا کی خدمت کرے۔" افتخار اور بلند حوصلگی سے اُس کے شانے سیدھے ہوگئے۔

پھر اُس نے قاسمی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا جن کی چمک میں اس نے بے پناہ برادرانہ تعلق اور انحصار و اعتماد کی لہریں اُٹھتی دیکھیں۔ "تم نے بڑا اچھا کیا جو شادی کے لئے راضی ہوگئے۔ خدا تمہیں بھی چاند سا بیٹا دے، پھر تم سمجھو گے کہ باپ کے جذبات اور احساسات کیا ہوتے ہیں! ——"

قاسمی زیادہ دیر تک نظر نہ ملا سکا، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اُس کے دل میں

خنجر بھونک دیا ہے۔

جوں جوں دن گذرتے گئے قاسمی کی بے کلی اور ماندگی، اور زاہدی کا اظہار مسرت، اس کے لئے مستقل ملامت بنتا گیا۔ دن رات کا کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا جب اسکے دل و دماغ پر ضمیر کی جرّاحی نہ ہوتی۔

ایک شب وہ کسی جان بہ لب مریض کو دوبارہ زندگی دیکر واپس آرہا تھا کہ اُس کا گذر دریا کے پُل پر سے ہوا۔ اللہ کے نیلے وسیع آسمان پر منوّر و پاکیزہ تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ دریا کا پانی مدھم سُروں میں گاتا، اٹھلاتا بہا چلا جارہا تھا۔ ہر چہار جانب پاکیزگی و حُسن کی بارش ہورہی تھی، مگر اُسے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ یہ تمام مناظر، یہ ساری دنیا، یہ کل کائنات اُس کے خلاف ہوکر بہ یک آواز بار بار کہہ رہی ہے "تم ناپاک ہو! تم نے شرافت اور انسانیت کے نام پر بٹّہ لگایا ہے! تم نے اپنے بھائی کو دھوکہ دیا! لعنت ہے تم پر!!"

اُس سے نہ سُنا جاسکا اور اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ معاً اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اپنے قابل نفریں وجود ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے، مگر فوراً ہی اُسے فیروزہ یاد آئی جس کے ٹوٹے ہوئے دل کو اُس نے پھر سے جوڑا تھا جس سے وعدہ کرکے اُس نے پھر سے ڈھارس دی تھی ——— اب پھر اُس کا دل پاش پاش کردینا کیا گناہ عظیم نہ ہوگا؟

آخر ایک دن اُن دونوں کی شادی ہوگئی اور قاسمی مصلحتاً فیروزہ کے ساتھ ایک علیحدہ مکان میں رہنے لگا۔ جو زاہدی کے گھر سے کافی دور تھا۔ اُس کی طبیعت گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنے بھائی سے علیحدہ رہے، اور زاہدی بھی پُرنم آنکھوں سے اُس کے اصرار پر، بہزار دقت راضی ہوا۔ لیکن اِس شرط پر کہ دن میں ایک دفعہ ضرور قاسمی زاہدی سے آکر مل جایا کرے۔

۱۴

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ فیروزہ کی آغوش میں مدہوش ہو کر اس نے محسوس کیا گویا وہ پہلے مریض تھا۔ جس کا تیز بخار اب اترا ہے۔ مضی ماضی، زندگی کو اب تو خوش آیند ہی ہونا چاہیئے۔ خوش آیند! اس کے اور اس کی خوبصورت و معصوم بیوی کے لئے ——— لیکن نہیں دفعتاً ماضی کے عفریت نے اپنا بھیانک چنگل بڑھایا اور اسے حال و مستقبل کے خوش کن جزیرے سے نکال کر اپنے بطن میں کھینچ لیا۔ اس نے سوچا ہی کیوں کہ وہ ضمیر اور اپنے کیے کی سزا سے بچ سکتا ہے؟

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وہ سراسیمہ ہوگیا، مگر ڈاکٹر کے فرض کے مطابق اسے سننا ہی پڑا۔

زاہدی بول رہا تھا "قاسمی! قاسمی! جلدی آؤ۔ فران کی طبیعت اچھی نہیں ہے"

قاسمی نے اپنا بیگ اور چند ضروری دوائیں ساتھ لیں اور فوراً زاہدی کے گھر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر، فران ہسٹریا کی مریضہ کی طرح قہقہے لگانے لگی " اوہو، تم آگئے؟ ذرا دیکھنا دودھیاں تڑ مار رہے ہیں ——— اوہ! یہ زندگی قدرت کا کیسا عجیب مذاق ہے۔

قاسمی نے اس کی طرف بڑھتے ہوے کہا " اس طرح نہیں چیخا کرتے "

فران کے چہرے کا خون خشک ہوگیا تھا۔ قاسمی کے الفاظ نے اسکے طیش کو اور زیادہ کر دیا " چیخا نہیں کرتے؟ اوہ، میں مری! مرد کیا جانے، مصیبت تو عورت کو جھیلنی پڑتی ہے ——— جس کی حالت اس مجروح کتے کی مانند ہوتی ہے جسکی زندہ کھال کھینچی جا رہی ہو "

زاہدی نے اس کی طرف بے چارگی اور اس طرح دیکھا گویا وہ متاسف ہے

فراآن نے اُس کی نظر میں ندامت دیکھ لی اور ایک طنزیہ ٹھٹا لگایا۔ "تم اِس کے ذمّے دار نہیں ہو!...... مجھے نہ ہنساؤ...... ہاں ہنساؤ۔ میں خوب ہنسنا چاہتی ہوں، خوب، بلکہ تم سب کو ہنسانا چاہتی ہوں۔ اس تکلیف کو میں اکیلی برداشت نہیں کروں گی...... تم دونوں اور تمہاری معصوم دلہن کو بھی تو معلوم ہو...... ......" تکلیف کی شدّت سے اُس سے آگے نہ بولا گیا۔ اور اُس کے منہ سے بیساختہ چیخیں نکلنے لگیں۔

"ایسا ہی ہوتا ہے، بھائی جان!" قاسمی نے جلدی سے زاہدی سے کہا۔ "بعض اوقات عورتیں، دورے میں اُنہی کے سر ہو جاتی ہیں، جنہیں سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ ذرا باہر چلے جائیے۔"

زاہدی کے جاتے ہی، اُس نے پوری طاقت سے فراآن کا بازو پکڑ لیا۔ پھر دل کے برابر جگہ پر کوئی دوا ملی اور پلک جھپکاتے، سرنج داخل کر دی۔ مارفیا نے خون میں تحلیل ہوتے ہی اُس پر جادو کا اثر کیا۔ اس کی چیخیں بند ہو گئیں اور گلے اور مٹھیوں کی اینٹھن جاتی رہی۔ پھر اُس نے ایک لمبا سانس لیا، گویا بہت تھک گئی ہے اور غافل ہو گئی۔

باہر سے زاہدی کے مضطربانہ ٹہلنے کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن قاسمی اپنے ڈاکٹری فرائض انجام دے رہا تھا۔ اُس نے معائنہ کیا۔ اُس کا شبہ صحیح نکلا۔ بچہ قدرتی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ——— اور اگر فراآن کی زندگی بچانی مقصود تھی تو فوراً ——— فوراً آپریشن ———

ایسا معلوم ہوا کہ کوئی سرگوشی کے لہجہ میں اُس سے جلدی جلدی کہہ رہا ہے۔ "ہاں، اور تمہارے سوا کسی کو اس کا علم نہ ہو سکے گا۔"

اُس نے اس آواز کی طرف سے اپنے کان بند کر لینے چاہے مگر وہ اور تیز ہوتی گئی۔

اور تیز، اور تیز، ” اگر یہ بچ گئی تو سب کچھ کہدیگی۔ وہ اب چپکی کیوں رہیگی؟ اور نتیجہ؟ زاہدی اور فیروزہ کا دل ٹوٹ جائیگا، اور خود تمہاری زندگی برباد ہوجائیگی ——— اسوقت سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اور کام بھی تو کوئی مشکل نہیں، صرف ٹھہر جاؤ، تاخیر کردو، فقط ایک گھنٹے کی۔ اپریشن میں دیر لگادو، یہ خود ہی ———“

اُس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، کوئی سن تو نہیں رہا؟ پھر فیروزہ کی معصوم اُلفت اور ایقان، اور زاہدی کی محبت اور اعتماد کا خیال آتے ہی اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ کون سی راہ اختیار کرے؟ ——— راز کی تدفین یا ایک زندگی کا تحفظ؟

اُس نے دوڑ کر ٹیلیفون اُٹھایا۔ ”زنانہ ہسپتال؟ میں ڈاکٹر قاسمی ہوں۔ ایمبولنس فوراً نمبر ۱۷ چربجن روڈ پر بھیجو۔ زچگی کے لئے آپریشن کا کمرہ!۔ ڈاکٹر مس شیلی کو میری طرف سے اطلاع کردو“

سب کچھ اسقدر مختصر وقت میں ہوگیا کہ قاسمی کو یقین نہیں آتا تھا۔ بیشک خدا کی حکمت کو انسان کہاں سمجھ سکتا ہے! ہرچند کہ وہ جانتا تھا کہ فرآن کے بچ جانے کی صورت میں فیروزہ اور خود قاسمی کی مسرّت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہے۔ پھر بھی اُسکی خواہش تھی، دلی خواہش کہ وہ بچ جائے۔

آپریشن کی کامیابی کی اُمید نہیں تھی۔ مگر وہ کامیاب رہا اور فرآن کے ہاں ایک خوبصورت و توانا لڑکی پیدا ہوئی ——— بلقیس!۔

فرآن کے لئے ہسپتال کا بہترین کمرہ لیا گیا تھا۔ دن رات ڈاکٹرنیوں اور نرسوں کی ڈیوٹی تھی۔

تیسرے روز سہ پہر کو قاسمی اُس سے ملنے گیا۔ وہ بیحد کمزور تھی۔ مگر اُس کا چہرہ غیظ و غضب سے سُرخ ہو رہا تھا ــــــــ کیونکہ اُس نے ایک نرس سے اصرار کر کے، آئینہ میں اپنی صورت دیکھ لی تھی۔

"میری صورت دیکھی ؟" اُس نے ہنکار کر کہا "میری اس بے رونقی کے ذمہ دار تم ہو! وہ تمہاری پرچھائیں بیوی کہاں ہے ؟ مجھے اس سے ایک بات کہنی ہے ــــــــ اسی وقت!"

وہ کچھ دیر اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا، جس سے نفرت و حقارت ٹپک رہی تھی "فرآن! یہ میں جانتا ہوں کہ تم کو سمجھانا بالکل بیکار ہے، اور افسوس اِس کا ہے کہ میں اب اپنے بھائی کو بھی اُن کی تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ بلکہ فیروزہ بھی اب مجھ سے متنفر ہو جائیگی" پھر ایکا ایکی اُسے جوش آگیا "نہیں، نہیں۔ میں اُسے لیکر یہاں سے کہیں چلا جاؤں گا۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں"

"میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ؟" اُس نے قاسمی کو دروازے میں سے جاتے ہوئے دیکھا اور آپے سے باہر ہو کر بولی "اچھا!!؟"

قاسمی جب فیروزہ کے گھر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ موٹر باہر کھڑی ہے اور فیروزہ جلدی سے اُس میں سوار ہو رہی ہے۔

"آئیے جلدی بیٹھ جائیے" فیروزہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "کوئی خوفناک سانحہ ہو گیا ہے۔ میں نے ٹیلیفون پر فرآن کو صرف اتنا کہتے سنا "سنو! مجھے تمہیں یہ بتانا ہے کہ......." معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔ ایک دم اُن کے منہ سے ایک ہولناک چیخ نکلی، اور پھر بہت سی آوازیں سنائی دیں، گویا لوگ اُن کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ شوفر! ذرا جلدی!"

ہسپتال پہنچکر معلوم ہوا کہ فرآن نے ایک نرس کو لالچ دیکر فیروزہ کو ٹیلیفون

پر بُلایا۔ اور پھر انتہائی جوش میں بولنا شروع کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ فیروزہ کو ساری حقیقت بتاکر قاسمی کی پارسائی کا تار تار بکھیر دے۔ نتیجہ! خون کی کوئی رگ پھٹ گئی! اور اچانک موت!۔

زاہدی نے خاموشی سے اُس کی موت کی خبر کو سُنا۔ خدا جانے کیوں اُسے اب بچی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، حالانکہ وہ اس کی پیدائش سے بیحد مسرور تھا۔ اور جب فیروزہ نے دوڑ کر بچی کو اٹھا لیا تو اس نے اجازت دیدی کہ تم اسے گود لے لو۔

"ہاں قاسمی!" اُس نے آہستگی سے کہا!"...... میں تو اب جلد چلا جاؤنگا ——— فرآن کے پاس۔ میرا اب وقت آگیا ہے۔ تم جانتے ہو مجھے اُس سے کسقدر محبت تھی اور اُس کے پاس پہنچکر میری روح کتنی خوش ہوگی...... تم اِس کی پرورش کرنا ——— اپنی اولاد کی طرح ———!"

۵

کبھی کبھی مغرب میں شفق پھولتی دیکھکر قاسمی کو اپنی زندگی کا سب اہم واقعہ یاد آجاتا ہے اور وہ باچشمِ گریاں قبرستان جاکر فرآن کی قبر کی پائنتیوں کھڑا ہو جاتا ہے جسپر زاہدی کا لکھوایا ہوا کتبہ نصب ہے:۔

آخر ——— ہم ہی ایک دن اسکے پاس چلے جائینگے
مگر ——— وہ اب کبھی ہمارے پاس نہیں آئیگی۔

پھر وہ حسرت بھری نگاہ دوسری قبر پر ڈالتا ہے جس کی گہرائی میں اُس کا بھائی ہمیشہ کے لئے آرام سے محوِ خواب ہے ——— وہ بھائی جس نے اُسے بیٹے کی طرح پال پوس کر جوان کیا۔ لیکن اُس نے اس کی عزت و حیات کو اپنی آتشِ نفس سے جلا کر، خاکستر کر دیا۔

سچ ہے کوئی کتنی بھی کوشش کرے کسی کی تحریرِ قسمت نہیں بدل سکتا۔

اُسے قرآن سے کوئی شکایت نہیں ہے، کیونکہ وہ تو جذبات و شباب کی ستائی ہوئی مریضہ تھی۔ جو کچھ اُس نے کیا، کوئی انسانی طاقت اُسے اُس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ البتہ وہ ——— ایک انسان تھا، ڈاکٹر تھا، بھائی تھا، ——— بھائی ایک ایسے شخص کا جو معذور تھا، اور جسے اُس پر کلّی اعتماد تھا، ایسے اچھے بھائی، ایسے شریف النفس شخص کی عزت خاک میں ملانی اُسے کسی طرح مناسب نہیں اُسے اپنے جذبات اور جوانی کا پامردی سے مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔

——— ان تمام باتوں کا احساس اُسے ہمیشہ سوختہ جان اور آتش زیرپا رکھتا ہے اور وہ اس خلجان سے تمام عمر چھٹکارہ نہ پا سکے گا۔ مگر جب وہ شکستہ دل گھر میں داخل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ فیروزہ ننھی بلقیس سے کھیل رہی ہے اور اسکی پرورش اور مستقبل کے متعلق بڑے بلند خیالات رکھتی ہے، تو وہ بظاہر مسکراتا ہے۔ لیکن اُس کی تاریک رُوح ....؟

(سنہ ۱۹۴۰ء)

حبش کی رقاصہ

پہلا باب

وہ حبش کا سب سے بڑا مذاقیہ ایکٹر تھا۔ اُس کی ہیئت بھی مضحکہ خیز تھی پست قد، بے ہنگم ڈیل ڈول، گنبد کی طرح پھیلی ہوئی توند، موٹے موٹے ہونٹ، اور دھنسی ہوئی گردن۔ اُس کا لباس بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھا۔ اور جب وہ اسٹیج پر اپنی مخصوص اداکاری دکھاتا تو لوگوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ اُس کی ظرافت کا دُور دُور شہرہ تھا۔ اس لئے وہ جس شہر میں جاتا ہزارہا آدمی روزانہ اُس کے کھیل دیکھنے آتے۔ اُس کے گروہ میں بارہ نوجوان لڑکیاں تھیں۔ جو وقتاً فوقتاً چھ چھ کی ٹولیوں میں اسٹیج کی دونوں جانب سے ناچتی ہوئی سامنے آتیں۔ یہ سب دوشیزگان بہار کی مانند نوعمر اور حسین تھیں لیکن ان کے حسن میں گلاب کے مستور کانٹے کی طرح ایک داغ لگا ہوا تھا۔

جس کا ذکر فسانہ نگار ضروری سمجھتا ہے۔

وہ مضحک خود سیاہ فام تھا شاید اسی لئے اُس کے دل میں ایک لگن تھی جسے وہ کسی صورت میں فراموش نہیں کرتا تھا اور وہ لگن تھی اُس کی اپنی رنگت اور نسل کی۔ آپ چاہیں تو اُس کی اس خواہش کو وطنی تعصب کہہ لیجئے۔ بہرحال وہ یہ چاہتا تھا کہ اُس کی ہمراہی لڑکیاں اُسی کے وطن کی ہوں۔ مگر حبش کی حدود سے نکل کر سیاہ حسن کسے پسند ہے؟ اس لئے وہ سفید فام رقاصاؤں کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھا۔ البتہ اُس نے یہ شرط لگا دی تھی کہ جو رقاصہ اُس کے ساتھ شامل ہونا چاہے اُس کی کسی پچھلی نسل میں سیاہ خون کی آمیزش ضرور ہو۔ اس کی عالمگیر شہرت اُس کے کام آئی اور وہ ایسی رقاصاؤں کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو نسلاً حبشی مگر سفید فام تھیں۔

یہ عجیب و غریب طائفہ شہر در شہر۔ ملک در ملک اپنے کمالات بہ حسن و خوبی دکھاتا پھرتا تھا اور لوگ اس ظریف کے پُر لطف تماشوں اور اس کی حسین رقاصاؤں کی دلفریب رعنائیوں کا مزہ لے لے کر ذکر کرتے تھے۔

ساحلہ کے عظیم الشان پنڈال میں آج اُن کا آخری کھیل تھا جسے دیکھنے کے لئے خلقت جوق در جوق آئی تھی۔ آگے کی صف میں شاہ فاہستان کا بھتیجا سفانی بیٹھا تھا۔ جو اپنے دوست عافی کی دعوت پر یہاں اِن دنوں سیاحت کی غرض سے آیا ہوا تھا۔

وقت مقررہ پر پردہ اُٹھا اور اس مسخرے کے اسٹیج پر نمودار ہوتے ہی ساری فضا قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ سفانی کو اس طرح لطف اُٹھاتے دیکھ کر عافی نے اُس کے کان میں کہا "ابھی کیا ہے آگے دیکھو! اب پریاں آنے والی ہیں" چنانچہ اس مضحک کے جانے کے بعد دونوں جانب سے طلائی و نقرئی رنگیں

چمکیلے کپڑوں میں ملبوس جمالستان کی بارہ پریاں چھم چھم کرتی نمودار ہوئیں۔ اُن کے لمبے لمبے بال ساقہائے سیمیں کو چومنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے رخساروں میں آب شباب چھلک رہا تھا۔ اور اُن کی نیم عریاں باہیں رقص میں مصروف تھیں۔ سفانی مبہوت ہو گیا۔

عاقی نے اُس کا شانہ ہلایا۔ "کچھ پسند آئیں؟"

سفانی گویا خواب سے چونکا "کس قدر دلفریب منظر ہے! اور یہ رقاصہ؟"

"تمہیں معلوم ہے، ان سب لڑکیوں کی نسل میں حبشی خون کی آمیزش ہے؟"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ ان کا رنگ تو دیکھو"

عاقی جواباً بولا "ہم نے تو یہی سنا ہے!...... اچھا تمہارے خیال میں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت کونسی ہے؟"

"بائیں ہاتھ سے تیسرے نمبر پر سنہرے بالوں والی"

"اس سے ملوگے؟ یہ حبشی میرا دوست ہے!"

"ہاں! ہاں! کب؟"

"کل!"

بس اس طرح اس سنہرے بالوں والی، میانہ قد، سیمیں بدن مگر نسلاً حبشی، رقاصہ سے سفانی کی ملاقات ہو گئی۔ چلتے وقت سفانی نے مینا کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر گفتگو شروع ہوئی اور وہ دونوں بہت جلد آپس میں گھل مل گئے۔ باتوں باتوں میں رات زیادہ آگئی تو مینا نے جانے کی اجازت چاہی۔ سفانی بولا "مینا! اب تو تمہاری چند روز کی چھٹیاں ہیں۔ کیوں نہ ہم کل

کہیں سیر کو چلیں ؟"

"میرا دل یہاں کی سیر کو چاہتا تو ہے۔ مگر......" وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

"مگر کیا۔؟"

"کچھ نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ تنہا ہی ہوں گے ؟"

"کیوں دوستوں کے ہونے میں کچھ ہرج ہے ؟"

"ہاں سفانی! اُن سے ذکر نہ کرنا۔ ورنہ ممکن ہے وہ تمہیں میرے ساتھ چلنے سے منع کریں۔ کیونکہ تم ایک اونچے گھرانے کے فرد ہو اور میں ——— تمہیں معلوم ہے رقاصہ ہوں ——— اور مجھ میں حبشی خون کی آمیزش بھی ہے"

آخر تم اس بات پر اسقدر زور کیوں دیتی ہو؟ کیا واقعی........؟"

"ہاں...... "نا مینا نے دریچے میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا" میری ماں مرکی تھی اور باپ حبش کا رہنے والا تھا"

"خیر چھوڑو بھی ان باتوں کو۔ ہم دونوں کل سہ پہر کو تنہا ہی سیر کرنے چلیں گے"

کیا وہ واقعی حبشن ہے ؟ لیکن اس کی ناک تو کھڑی اور ستواں ہے۔ اس کا دہانہ چھوٹا اور لب پتلے ہیں۔ اس کی آنکھیں بھوری اور بال سنہرے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ سفید فام ہے! نہیں وہ حبشن نہیں ہو سکتی۔ یہ اس مرد مضحک نے قطعی اپنی تشہیر کے لئے ایک ڈھونگ رچایا ہے!...... ساری رات وہ انہی خیالات میں اُلجھا رہا۔

دوسرے روز شام کو ساحل سے کئی میل پرے وادی کوہسار میں جہاں ایک منچلا دریا خراماں بہہ رہا تھا ایک گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں سفانی اور مینا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہوائے ایک لطیف جھونکے نے

اُن پر سدا بہار پھولوں کی بارش کر دی۔

"مینا!" سفانی نے اُس کی معصوم نگاہوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام کتنا پیارا ہے! یہ تمہاری ماں نے رکھا تھا؟"

"نہیں یہ میں نے بعد میں رکھ لیا۔ کیونکہ اس میں روانی زیادہ ہے" وہ سفانی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں وہاں سے اُٹھے اور رنگ برنگ کے دلکش پھول دیکھتے اور چُنتے یہاں سے وہاں اور ادھر سے اُدھر ہرن کے جوڑے کی طرح خوش خوش دنیا و مافیہا سے بے خبر سیر کرتے رہے۔ ایک سرسبز درخت پر پہاڑی طوطا اپنی مادہ سے اظہارِ الفت کر رہا تھا۔ سفانی نے وہیں نظریں مینا پر ڈالیں ——— مینا شرما گئی۔

رات ہو چکی تھی۔ اور آسمان پر ماہِ نیم ماہ اپنی پوری تابانی سے چمک رہا تھا۔ مینا بولی۔ "چاند اس وقت کتنا خوبصورت معلوم ہو رہا ہے!"

"——— لیکن میرا چاند تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے" سفانی نے خواب آلود نظروں سے جواب دیا۔

محبت کی چنگاری سُلگ کر شعلہ بن چکی تھی۔ سفانی بے اختیار ہو گیا اور شکستہ آواز میں بولا۔ "مینا! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

مینا کے چہرے پر جوش محبت اور غم وحسرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور وہ رو کر کہنے لگی "آہ! میں کیسے کہوں ...... تم کو مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہئے۔ خدارا اب مجھے معاف کر دو کہ میں تمہارے ساتھ چلی آئی ——— شاید میں ہی ذمہ دار ہوں"

"نہیں مینا! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے" وہ مضطرب ہو کر کہنے لگا۔

"دیکھو سفانی!" مینا کے لب آنسوؤں سے تر ہو گئے تھے۔ میرے سفید خون میں سیاہ خون کی آمیزش ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"مجھے انجام کی فکر نہیں" وہ بے قابو ہو کر بولا۔

"لوگ کیا کہیں گے؟ اور تمہارے ماں باپ؟ مینا نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔

"میں لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے۔ جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا ہوگا مینا! میرے ارمانوں کو یوں برباد نہ کرو۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہوں" وہ پاگلوں کی طرح کہے جا رہا تھا" مینا بولو! کیا تم میری زندگی کی خاطر مجھ سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوگی؟"

مینا سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کے بے پناہ آنسو اقرارِ محبت کر رہے تھے۔

دوسرا باب

دوسرے روز مینا اُس طائفہ سے الگ ہو گئی اور سفانی اُسے ساتھ لیکر ساحلہ سے سینکڑوں میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں چلا گیا جہاں اُنہوں نے شادی کر لی۔ یہ مقام اُن کو بہت پسند آیا اور وہ دونوں یہیں رس بس گئے۔

سفانی نے پھلوں کا ایک بڑا سا باغ خرید لیا۔ جس کی نگہداشت میں وہ خود بھی حصہ لیتا تھا کیونکہ اُن کی بسر اوقات اب اِسی پر ہوتی تھی۔ اُن کے دن کا بیشتر حصہ سیدھے سادے لوگوں کے ساتھ صرف ہوتا اور شام کو پھولوں کی کیاریاں اور زمین و آسمان کے جلوے اُن کا دل لبھاتے تھے۔ جب کبھی سفانی آنکھ اُٹھاتا مسکراتی ہوئی مینا اُس کے سامنے ہوتی اور جب کبھی مینا نظریں اونچی کرتی تو سفانی اُسے آغوشِ محبت میں لینے کے لئے بیتاب نظر آتا۔

ایک روز صبح سفائی اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایکا ایکی اس کے چہرے سے رنج ہویدا ہونے لگا۔ مینا نے دیکھا تو بے چین ہوگئی۔ "کیا ہے؟" اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میرے چچا کا انتقال ہوگیا" سفائی نے آہستہ سے جواب دیا۔

مینا کو بھی اس کا افسوس ہوا —— لیکن حقیقتاً اسے زندگی کے چمکدار آئینے میں کوئی مدھم سا سایہ پڑتا معلوم ہوتا تھا وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "تو اس کی خبر اخبار میں کیوں درج ہے؟"

"کیونکہ وہ فاہستان کے بادشاہ تھے۔ اُن کے دل کی حرکت دفعتاً بند ہوگئی —— مرحوم کے دو بیٹے ہیں"

مینا کو گویا دھکا سا لگا۔ وہ متحیر ہو کر بولی: "تو تم شاہ فاہستان کے بھتیجے ہو؟"

"ہاں! میرے والد، مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے" سفائی نے بغیر کچھ سوچے ہوئے کہا۔

"اے خدا! —— سفائی! تم نے یہ مجھے پہلے کبھی نہیں بتایا ——"

اس کی دراز پلکوں پر آنسو جسم گئے۔ اور وہ ٹھہر کر بولی "تم تو بڑے آدمی ہو!"

سفائی نے محسوس کر لیا کہ اس کا یہ اقدام غلط تھا، چنانچہ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا "تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟ ہماری خوشیوں میں تو کوئی چیز مانع نہیں ہوگی"

وہ رو پڑی۔ "تم مجھے چھوڑ کر اپنے وطن تو نہیں چلے جاؤ گے؟ تم وعدہ کرتے ہو؟ سفائی میں اپنے دل کو کیسے یقین دلاؤں؟"

سفائی نے اُس کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اُس کے بالوں پر اپنے لب رکھتے ہوئے بولا۔ "مینا تم ایسی باتیں سوچتی ہی کیوں ہو؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ

تمہارا رہوں گا۔ اور تمہیں چھوڑ کے کبھی یہاں سے نہ جاؤں گا" پھر اُس نے معاملہ کو یکسو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سلمان اب فاہستان کا بادشاہ ہوگیا ہے۔ ہمیں اُس کو مبارکباد بھیجنی چاہیئے۔ میں اُسے اپنا پتہ بھی لکھدوں گا اور یہ بھی کہ میری شادی ہوگئی ہے۔ سلمان میرا بچپن کا دوست ہے۔ تمہاری طرف سے بھی مبارکباد بھیجدوں ؟"

"ہاں ــــــ" مینا نے قدرے اطمینان سے کہا۔

ایک سال ہنسی خوشی گذر گیا۔

ایک دن وہ دونوں سیر سے واپس آئے تو سفانی نے میز پر ایک تار پڑا دیکھا۔ جس پر فاہستان کے بادشاہ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

"تار ــــــ!؟" مینا نے تعجب اور کسی مبہم خیال سے ڈرتے ہوئے کہا۔

"شاہ فاہستان کے نام ہے" سفانی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "غالباً سلمان ہم دونوں سے ملنے آرہے ہیں۔ کسی نے فاہستان سے اُنہی کے نام سے تار بھیجا ہوگا"

"اسے پڑھکر تو دیکھو"

"لیکن یہ تو سلمان کے نام ہے"

"ممکن ہے کسی بہت ضروری معاملے کی اطلاع ہو" مینا نے تار اسکی طرف سرکا دیا۔

سفانی انکار کرنا چاہتا تھا۔ مگر مینا کا اصرار غالب آیا اور اُس نے تار کھول لیا ــــــ اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لکھا تھا۔

"موٹر کے حادثہ سے بادشاہ اور اُن کے چھوٹے بھائی کا

انتقال ہو گیا ہے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ حضور عالی جس قدر جلد ممکن ہو تشریف لے آئیں۔"

مینا سناٹے میں آ گئی۔ "کیا یہ سچ ہے؟ کیا غلطی کا امکان نہیں؟" اُس نے فرطِ غم سے کہا۔

"نہیں یہ مخصوص شاہی فارم ہے۔"

مینا کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ مایوس ہو کر بولی "سفائی! تو تم اب شاہ فاہستان ہو؟"

"اور تم ملکۂ فاہستان!" اس نے انبساط سے کہا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اُس کے دل کی بھٹی میں آگ سلگا رہا ہے۔ اُس کا چہرہ سُت گیا اور وہ بے قابو ہو کر چیخی "نہیں میں ملکہ بننا نہیں چاہتی۔ مجھے اجنبیوں اور شہزادیوں میں جانا پسند نہیں ——— کاش میں جان لیتی کہ ہماری زندگی میں یہ تغیر ہونے والا ہے؟"

"کیسی بچپنے کی باتیں کرتی ہو۔ مینا! تم نہیں جانتیں کہ وہاں تم کس قدر آرام سے رہو گی؟" اُس نے قدرے سختی سے کہا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ وہ جان جائیں گے۔ کہ میں کون ہوں......"

وہ آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"پھر کیا ہو گا! جان لینے سے ہمارا کیا بگڑ جائے گا؟ تم تو بہرصورت میری محبوب بیوی اور ملکۂ فاہستان رہو گی" اُس نے ذرا تکبر سے کہا۔

"نہیں ———" مینا التجا کرتے ہوئے بولی "کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ ہماری مسرور زندگی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو گی۔ سفائی! خدا کے واسطے یہاں سے نہ جاؤ۔"

"وہ مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ ممکن ہے وہاں کوئی حکمراں نہ ہونے کی وجہ

سے بغاوت ہو جائے۔ اور مینا تم تو وہاں بہت خوش رہو گی۔ وہاں کے باغات سفید مور۔ سُرخ طوطے، بید مجنوں کی بیلیں، شمشاد کے خوبصورت درخت، مرمر کے حوض اور نہریں۔ محل کی بلند دیواریں، شاہی عیش و آرام، یہ سب تمہارے لئے چشم براہ ہیں۔" اُس کی آنکھیں خیالستان کی سیر کر رہی تھیں۔

مینا جان گئی کہ اُس کی التجا بیکار ہے، اور سفاقی پر اب کسی طرح اثر نہیں ہو گا۔ آخر اُس نے اتنا اور کہا۔ "اچھا بچے کی پیدائش تک نہ جاؤ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس میں تو ابھی چھ مہینے باقی ہیں۔ اس عرصہ میں ممکن ہے وہاں کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ اس کے علاوہ میں چاہتا ہوں کہ بچہ قصر شاہی میں پیدا ہو اور اسی کمرے میں جہاں پشتوں سے ہمارے ولی عہد پیدا ہوتے آئے ہیں ——" اُس نے اپنا عزم مصمم کرتے ہوئے جواب دیا۔

مینا اب مجبور تھی۔ اُسے راضی ہونا پڑا۔

تیسرا باب

آخر وہ دن بھی آگیا جب بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کی آمد کے ہر چہار طرف شادیانے بجنے لگے۔ رنگ برنگ کی جھنڈیاں شہر پناہ سے لیکر قصر شاہی تک سجائی گئی تھیں اور لوگ جا بجا بڑی بے صبری سے اپنے نئے حکمراں کا انتظار کر رہے تھے۔

سفاقی اُن کے لئے کوئی نیا شخص نہیں تھا البتہ وہ مینا کو نہیں جانتے تھے۔ اسلئے اُسے دیکھنے کا ہر شخص مشتاق تھا۔

سورج نکلے چند ہی گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ شاہی سواری شہر میں داخل ہوئی اور تمام رعایا دو رویہ مؤدبانہ کھڑی ہو گئی۔ لوگ بڑے خوش نظر آتے تھے۔ ملکہ توقع سے زیادہ حسین نکلی!۔

بڑی بڑی دکانیں، عالیشان عمارات وسیع میدان صاف وشفاف سڑکیں، عظیم الشان مکانات ـــــــ اِن سب کو مینا نے دیکھا اور اس خیال سے اب اُس کے دل میں بھی خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی کہ وہ ان سب کی ملکہ ہے۔ اور ہزاروں مردوں، عورتوں، اور بچوں کی حکمراں!

پھر وہ دونوں سنگ مرمر کے نادر الوجود محل میں داخل ہوئے جسکو سورج کی چمکیلی کرنیں طلائی ویسی غسل دے رہی تھیں۔ خدام کا ایک بڑا دستہ اُن کے سامنے جھک گیا۔ اور امراء اور اراکین دربار بادشاہ سلامت کو تاج پہنانے آگے بڑھے۔

محل کے باہر لوگ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور بادشاہ و ملکہ کی درازی عمر کے نعروں سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔

سفانی ہر وقت اِس کوشش میں رہتا کہ مینا کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور اس خیال سے کہ مبادا اُس کا حکومت کے کاموں میں انہماک مینا کو گراں گزرے وہ اُس کی ہر طرح دلجوئی کرتا چنانچہ مینا اکثر چاندنی راتوں میں سفانی کے ہمراہ ہمالہ کے سفید موروں کو زمردیں میدانوں میں ناچتے دیکھتی۔ لالہ و یاسمین کے پھولوں سے کھیلتی اور مرمری حوضوں میں جہاں کنول کے پھول تیرتے غسل کرتی۔ مینا کو مسرور دیکھ کر سفانی بھی مسکرا دیتا تھا۔

سارا دن اسی طرح ہنس ہنس کر گذر جاتا۔ رات کے وقت سونے سے پیشتر اکثر اس کے خیالات گردش کرتے اور وہ اپنے پچھلے دنوں کو خواب کی طرح یاد کرنے لگتی۔ اسے والدین یاد آتے اور اُن کے ساتھ وہ زمانہ جبکہ اُس کی زندگی خاص بیفکری سے گذر رہی تھی۔ اُسوقت وہ پڑوس کی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے وقت بالکل شہزادی معلوم ہوتی تھی...... پھر چند سال بعد اس نے ایک دن دیکھا کہ

اُس کی ماں دھاروں رو رہی ہے۔ کیونکہ ——— اس کا باپ مر چکا تھا۔ بس اُس وقت سے مفلسی میں ماں کا کپڑے سی سی کر گذارا کرنا اور اس کا چھوٹے موٹے کام میں مدد دیکر ایک وقت کا کھانا حاصل کرنا۔ پھر ——— جوانی اور بے مثیل رقص حبس کی بنا پر سینکڑوں خوشامدیں کر کے اُس مضحک نے اسے اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ پھر ——— سفانی سے ملاقات ——— اور ——— اور!

محل میں وہ تھوڑی دور بھی چلتی تو خواصیں اُس کے آگے دوہری ہو جاتیں اور اُسوقت اُسے فوراً خیال آتا۔ اب میں ملکہ ہوں لیکن ——— تین سال پیشتر؟

آخر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ملکہ محترمہ اب ماں بننے والی ہیں.....

لوگ ولی عہد کی پیدائش کے خیال سے بے حد مسرور تھے۔ مگر وہ آپس میں عامیانہ انداز میں یہ بھی کہتے تھے کہ خدا کرے لڑکا ہو۔ کیونکہ موجودہ بادشاہ اپنی نسل کے آخری فرد ہیں۔ اگر لڑکا نہ ہوا تو اُن کے بعد تخت دوسرے ہاتھوں میں چلا جائیگا۔ اور ——— ہم لوگ کسی غیر کو اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرینگے۔

رعایا بے شک خوش تھی۔ لیکن جوں جوں دن قریب آتے جاتے مینا افسردہ اور متوحش سی ہوتی جا رہی تھی۔ سفانی اُس کی پریشانی کی وجہ اُس سے بار بار پوچھتا مگر وہ اس راز کو اُس پر کسی طرح ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آخر بچے کی پیدائش کا وقت آ گیا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سفانی تفکرات میں غرق محل کے ایک کونے میں خبر کا منتظر بیٹھا تھا۔ اُس نے سوچا آج یہ لمحے اتنے طویل کیوں ہو گئے ہیں؟ وقت کی رفتار میں وہ پہلی سی تیزی کیوں نہیں رہی؟۔

آخر کار ڈاکٹر اُس کی طرف مسکراتا ہوا لپکا "مبارک ہو!" اُس نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا "لڑکا نہایت خوبصورت اور توانا ہے!"

"اور ملکہ ؟" سفانی نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

"بالکل اچھی ہیں!"

"میں اندر ہو آؤں"

"ابھی نہیں" ڈاکٹر بولا "جب ملکہ معظمہ بیدار ہو جائیں تو آپ چلے جائیے گا"

مینا جاگی اور اُس نے کھوئی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور کہا "میرا بچہ!" نرس کپڑوں میں لپٹے ہوئے بچے کو لیکر آگے بڑھی۔ مینا کا دل دُھڑ پکڑ کر رہا تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے بچے کا سر کھولا۔ اور جب بچے نے آنکھیں کھول دیں تو وہ فرط مسرت سے اُچھل پڑی۔ "اسے مجھے دیدو"

اتنے میں سفانی اندر آ گیا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی بے قابو ہو گئی۔ "سفانی! دیکھو اِس کے ہونٹ پتلے ہیں۔ اور آنکھیں بھوری!"

سفانی اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ لیکن اسکی خوشی میں شریک ہو گیا۔

ولی عہد سلطنت کی پیدائش کا اعلان کر دیا گیا۔ لوگ اسقدر خوش ہوئے گویا انہیں جنت مل گئی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے کاروبار بند کر کے کئی دن تک جشن منائے۔

مینا ماں بننے کے بعد اپنے شوہر کی طرف سے غافل نہیں ہوئی۔ بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد سے تو وہ سفانی کو اور بھی چاہنے لگی اور ساتھ ہی اُس کا دل بچے میں بھی لگا رہتا تھا۔ وہ اکثر اُسے اپنی گود میں لئے رہتی تھی اور کبھی اُس کے پتلے ہونٹوں، کبھی بھوری آنکھوں، اور کبھی چھوٹی سی ٹھوڑی کو پیار کرتی اور کبھی اُس کے شوخ رخساروں اور کبھی ننھے منے ہاتھ پاؤں کو چومتی۔

تین سال اور گذر گئے۔

سفانی طوفیہ کے بادشاہ کے ہاں مہمان تھا کہ اُسے بچے کی علالت کی خبر ملی۔ اور جب تک وہ روانہ ہوا سے مزید اطلاع پہنچی کہ بچے کی حالت نازک ہوگئی ہے۔ پرسکون تالاب میں یکبارگی اضطراب کی مانند سفانی پریشان ہوگیا۔ اور جسقدر جلد ہوسکا وہ وہاں پہنچا۔ محل میں داخل ہوکر اُس نے دیکھا کہ مینا مجسم غم بنی معصوم بچے کے سر بالین کھڑی ہے۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر اس باغبان کی طرح مایوسی اور حسرت برس رہی تھی۔ جو اپنے خونِ جگر سے سینچے ہوئے چمن کو اپنی آنکھوں سے اُجڑتا ہوا دیکھتا ہے۔

ولیعہد سلطنت شہزادۂ فاہستان بستر مرگ پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اُس نے باپ کی صورت کو حسرت سے دیکھا اور ایک ہلکی سی سُبکی کے ساتھ اس کی روح تنِ خاکی سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوگئی۔

مینا کی حالت کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ اُسے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ اُس کا لال اس سے چھُٹ گیا ہے۔ کیا اب وہ کبھی اس کو "اماں" کہکر نہ پکارے گا؟ کیا ماں بیٹے کے تعلّقات ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے؟ کیا اسکا جگر گوشہ اب کبھی اپنی اماں کے ساتھ برفانی موروں اور سُرخ طوطوں کو دانہ نہیں کھلائیگا؟ اس کی تمام اُمیدیں اور ولولے ختم ہوگئے تھے۔ وہ کبھی پتھر کی مانند ساکت ہوجاتی تھی اور کبھی گھنٹوں روئے جاتی تھی۔ بچے کے پلنگ، تکیے، گدّوں اور کپڑوں کو وہ بار بار چومتی، آنکھوں سے مَلتی اور آٹھوں پہر روتی رہتی لیکن سفانی سمیت کوئی بھی اس کے صدمے کو کم نہیں کرسکتا تھا۔ اُسے ہر دم مرحوم بچے کا خیال ستاتا رہتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کبھی اِس کونے سے آکر اُس کے گلے میں باہیں ڈالے رہا ہے اور کبھی اُس کونے سے ماں کہکر پکار رہا ہے۔ جب

اُس کے لمبے لمبے آنسو بالکل خشک ہو گئے تو اُس پر وہی پہلی سی کیفیت طاری ہو گئی خاموشی اور دیوانہ پن! یہ اور بھی خطرناک تھا۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ سفانی، مینا کو کسی دوسرے مقام پر لیجائے۔ تاکہ اس کا دھیان بٹے۔

شہزادے کے انتقال سے رعایا بھی بیحد غمگین تھی۔ اُس کی پیدائش پر لوگوں نے جسقدر چراغاں کئے تھے اب اتنا ہی ماتم کیا۔ مزید براں اُن کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ ——— کہیں کوئی غیر ہم پر حکومت نہ کرے!۔

چوتھا باب

رفتہ رفتہ وہ خاموشی کم ہو گئی اور جب سفانی نے دیکھا کہ مینا اب پھر دنیوی کاموں اور تفریحی مشاغل میں دلچسپی لینے لگی ہے تو وہ دونوں اپنے وطن واپس لوٹے۔

لوگوں میں ایک دفعہ پھر باتیں ہونے لگیں کہ عُلیہ حضرت ملکہ معظمہ ماں بننے والی ہیں۔

سفانی صحن کے ایک کونے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بچّہ ہونے سے اکثر مائیں تو خوش ہوتی ہیں۔ لیکن مینا نہ معلوم کیوں غمگین اور افسردہ ہو جاتی ہے حالانکہ اسے تو اور بھی مسرور ہونا چاہیئے کہ اس کا بیٹا اتنی بڑی سلطنت کا حاکم ہوگا۔

ڈاکٹر سفانی کی طرف بڑھا۔ مگر اس دفعہ اُس نے مبارکباد نہیں دی۔

سفانی مضطرب ہو کر بولا "میری ملکہ ———؟"

"بخیریت ہیں"

"اور بچہ......؟" اُس نے بےچینی سے پوچھا۔

ڈاکٹر ہچکچایا "لڑکا ہے......"

"اندھا؟ ——— لنگڑا؟"

"نہیں جسمانی طور پر بالکل تندرست"

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو　بتاتے کیوں نہیں؟"

ڈاکٹر بڑی کشمکش میں تھا۔

"خدا کے لئے مجھے بتا دو آخر بات کیا ہے؟" بادشاہ نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر مجبور ہو کر بولا "ملکہ معظمہ کی نسل میں سیاہ خون کی آمیزش......"

"ہاں، ہاں، ٹھیک ہے...... تو پھر؟"

"بچے کا رنگ ——" شاہی رعب کی وجہ سے ڈاکٹر کی آواز پوری طرح نہیں نکلتی تھی۔

"سانولا ہے؟" سفاکانی نے حیرت اور رنج سے پوچھا۔

"نہیں بلکہ سیاہ اور بالکل حبشیوں کی طرح........" اس نے بمشکل تمام کہا۔

سفاکانی کو اس صدمہ سے یوں دوچار ہونا پڑا جیسے کوئی جنگی جہاز دفعتاً کسی چٹان سے ٹکرا جائے۔ اتنے میں دایہ دوڑی ہوئی آئی۔ "ڈاکٹر صاحب! ملکہ معظمہ حضور ولی عہد کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ اگر آپ اجازت نہ دیں گے تو ممکن ہے وہ ——"

ڈاکٹر جانتا تھا کہ بچے کا دکھانا ملکہ کے لئے مہلک ہو سکتا ہے۔ مگر ملکہ کی ضد بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھی۔ آخر وہ سوچ کر بولا "میں ملکہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، اگر وہ نہیں مانیں تو پھر بچے کو دکھانا ہی پڑے گا۔"

ڈاکٹر کی شکل دیکھتے ہی مینا چلائی "میرا بچہ؟ میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر اُسے تسلی دیتے ہوئے بولا "بچے کو نہلایا جا رہا ہے۔"

لیکن وہ کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ "اُسے فوراً میرے پاس لے آؤ، میں حکم دیتی ہوں۔"

اُس پر غشی طاری ہوتے دیکھکر ڈاکٹر نے اشارہ کیا اور دایہ کپڑے میں لپٹے ہوئے اعلیٰحضرت ولیعہد سلطنت کو لے آئی۔

مینا نے جلدی سے اُس کا منہ کھولا ——— ؟ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ ایک آہ سرد کھینچ کر جس میں بہت سی تمناؤں کی بربادی پنہاں تھی خاموش لیٹ گئی۔

جس چیز سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھی آج وہی اُس کے سامنے آگئی۔ گھنڈی دار سخت بال!، موٹے موٹے ہونٹ! پھیلا ہوا دہانہ! چندی اور اندر دھنسی ہوئی آنکھیں! بیٹھی ہوئی اور چپٹی ناک! آخرکار...... حبشی!!۔

مینا کی نظروں میں دنیا اندھیر تھی۔ اس کا دل اِس دار رنج و محن سے بھر چکا تھا اُس کی دلی خواہش تھی کہ خدا اُسے اپنے پاس بُلالے۔ وہ نہ کسی سے بات کرتی اور نہ آنکھیں کھولتی تھی۔ اب اُسے بچے کو دیکھنے کا مطلق اشتیاق نہیں تھا۔ بلکہ وہ اسکے متعلق کچھ سننا تک نہیں چاہتی تھی۔ عہد گذشتہ اس کے لئے ایک دھندلکا سا بنکر رہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ بے عزتی جس کا سامان اُس نے اس حبشی بچے کی پیدائش سے مہیا کر دیا ہے۔ اسقدر سنگین ہے کہ اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا اور جب یہ بات سب کو معلوم ہو گی ——— بہرحال ایک روز ہونی ہی ہے ——— تو کہیں مُنہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ اُس کا بیشتر وقت دیوار کی طرف رُخ کئے، مُنہ پر کپڑا اڈالے اور آہ و زاری میں بسر ہوتا تھا۔

ایک خادمہ نے جو شب بھر ملکہ کی خوابگاہ میں رہتی تھی بیان کیا کہ ملکہ معظمہ اکثر رات کو خواب میں کہتی ہیں " مجھے معاف کر دو۔ پیارے سفاتی " اور پھر کچھ بڑبڑاتے بڑبڑاتے کہنے لگتی ہیں " اب اسے مجھ سے نفرت ہو گئی ہوگی۔ وہ مجھ سے خفا

محبت نہیں کرسکتا۔"

سفائی کے پیہم اصرار پر ڈاکٹر راضی ہوگیا کہ آج رات بجائے خواص کے بادشاہ سلامت ملکہ کی خواب گاہ میں جاکر بیٹھ جائیں۔ چنانچہ آدھی رات کو جب مینا کی آنکھ لگ گئی تو سفائی اُسکی مسہری کے پاس جاکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کوئی دو گھڑی کے بعد مینا درد بھری آواز میں بڑبڑائی "مجھے معاف کردو پیارے سفائی ....!"

سفائی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

مینا نے آنکھیں کھولیں ——— سامنے سفائی آبدیدہ بیٹھا اُس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمین میں سما جانا چاہتی ہے۔

سفائی کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تھا۔ اُس نے مینا کے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے لبوں سے لگالئے۔ اور والہانہ انداز میں کہنے لگا "میری مینا! ذرا سنبھلو تم نے اپنا یہ کیا حال بنایا ہے؟ تمہیں کس بات کا رنج ہے؟ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا مگر میں نے ہی پرواہ نہیں کی۔ پھر تم کیوں کسی بات کا فکر کرتی ہو؟ اس کا ذمہ دار تو میں ہوں۔ مینا! تمہارے اِس طرح پریشان رہنے سے میری زندگی اجیرن ہوئی جاتی ہے۔"

گویا کسی نے مرجھائے ہوئے پھول پر شبنم کے موتی بکھیر دیئے ہوں۔ مینا کی طبیعت میں تغیر پیدا ہوگیا۔ اُسے جس چیز کی ضرورت تھی وہ اُسے آج مل گئی۔ سفائی اب بھی اُس سے محبت کرتا ہے!۔ اس خیال نے اس پر بڑا زبردست اثر کیا۔

"پیاری مینا! کیا تم میری خاطر مسکراؤ گی نہیں" اُس نے اُس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ مینا نے اُسکی طرف دیکھا۔ اُس کی نیم باز آنکھوں میں پھر

وہی جلوۂ مستانہ رقصاں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "سفانی!!"

——— یہ سب کچھ سہی، مگر چند قدم کے فاصلہ پر ایک حبشی بچہ پڑا ہوا ہے وہی بچہ جو فاہستان کا شہزادہ ہے اور جسے ایک دن باپ کے بعد فاہستان پر حکومت کرنی ہے۔

ہوتے ہوتے یہ خبر محل کے باہر بھی پہنچ گئی۔ مگر بعض لوگوں نے اسے محض افواہ سمجھا البتہ جب سالگرہ کے جشن کو ٹال دیا گیا تو تمام رعایا میں ہل چل مچ گئی اور اُن کو یقین ہو گیا کہ شہزادہ حبشی النسل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں حقارت سی پیدا ہو گئی اور جب ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ پہلا بچہ گورا اور خوبصورت ہونے کے باوجود دوسرا بچہ سیاہ اور اپنی اصل نسل کا ہونا ممکن ہے۔ تو امرا اور رؤسا میں خیال آرائیاں ہونے لگیں۔ وہ کہتے تھے کہ اس سیاہ و سفید کا ارتباط بادشاہ کی پشت میں تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ اُن کے باپ دادا کو حکومت کرتے ہوئے برسوں گذر گئے اور کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ اِس لئے حبشی نسل یقیناً ملکہ ہی کی ہے۔

مینا ایک دفعہ شام کو تفریح کی غرض سے نکلی۔ لوگوں نے اس دفعہ بھی اُس کی تعظیم و تکریم کی ——— مگر اُن کے چہروں سے نفرت و حقارت ٹپکتی تھی۔

اُس نے محل سے باہر نکلنا چھوڑ دیا اور صرف سفانی ہی کے سایے میں گویا پناہ لی۔ سفانی اُس سے دن بھر میں کئی مرتبہ محبت کا اظہار کرتا اور اس میں شک نہیں کہ وہ اُس کو اب پہلے سے زیادہ چاہتا تھا۔ مگر ایک چیز مینا کے دل میں رہ رہ کر کھٹکتی تھی اور وہ یہ کہ سفانی شب کو کبھی مینا کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔

پانچواں باب

ولی عہد کے حبشی النسل ہونے کی خبر دوسری سلطنتوں میں پہنچ گئی لہذا

اِس دفعہ کسی نے بھی اُس کی پیدائش پر مبارکباد نہیں دی! یہانتک کہ طوفیہ کا بادشاہ بھی جو سفانی کا اس قدر دوست تھا خاموش رہا۔ بلکہ ایک ملاقات کے دوران میں دبے الفاظ میں کہنے لگا: "میں نے سُنا ہے کہ ولی عہد۔۔۔۔۔"

سفانی بات کاٹ کر بولا: "یہ صحیح ہے مگر اس میں ملکہ کا کوئی قصور نہیں اُنہوں نے شادی سے پہلے کئی بار بتا دیا تھا۔ اور شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن میں نے ہی اُن کو مجبور کیا۔"

"ممکن ہے یہ امر سیاسی معاملات میں مخل ہو" طوفیہ کے بادشاہ نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

بات گئی گذری ہو گئی۔ لیکن یہ ایک ایسا نشتر تھا جو جگر میں نیم کش ہو کر رہ گیا۔ اور غم اُسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھانے لگا۔

اب تو بچہ بچہ بھی اصلیت سے واقف ہو گیا تھا اور اسی لئے مینا کی نگاہیں کسی کے سامنے نہیں اُٹھتی تھیں۔ اِس کے علاوہ وہ دیکھ رہی تھی کہ سفانی گھُل گھُل کر آدھا رہ گیا ہے۔

وہ اُس سے بارہا پوچھتی مگر سفانی ہمیشہ اُس سے اپنے دل کا بھید چھپانے کی کوشش کرتا۔ آخر مینا نے تہیہ کر لیا کہ جس رنج کو وہ اکیلا سہہ رہا ہے اس میں وہ بھی شریک ہو گی۔ اور اس کے اصرار پر مجبور ہو کر سفانی کو بتانا ہی پڑا۔ یہ وہ پہلے ہی جانتی تھی۔ سُنکر اُس کے پژمردہ چہرے پر اور بھی زردی چھا گئی اور وہ حسین مسکراہٹ جو اکثر لب ہائے لعلیں پر رقصاں ہوتی تھی، ہمیشہ کے لئے اُس سے چھن گئی۔

ایک دفعہ مینا اور سفانی شہ نشین میں ٹہل رہے تھے کہ ناگہاں اُن کی نظریں حبشی شہزادے پر جا پڑیں۔۔۔۔۔ بچہ رو یا اور اُس کا وسیع دہانہ جھیل کی طرح پھیل گیا۔

سفانی نے منھ پھیر کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور بے اختیار چیخا "او خدا۔ ......خدا نہ کرے کہ ______"

دفعتاً اُسے مینا کا خیال آگیا۔ وہ اس کی طرف مڑا اور فوراً اُسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی سنگین جرم کیا ہے۔

"ملکہ! مجھے معاف کردو۔ میرے منہ سے بے دھیانی میں نکل گیا......"

مینا نے مُسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "سرتاج! معافی کس بات کی؟"

سفانی نے اسے اپنے آغوش میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلادیئے۔ مگر معاً کسی خیال سے رک گیا اور سمجھا کہ مینا نے اُسے ہاتھ پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ دیکھ چکی تھی!۔

سارا دن مینا کا دماغ مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بنا رہا اور جب رات ہوئی تو اُس وقت بھی اُسے ذہنی خلفشار سے چھٹکارا نہیں ملا۔ وہ اپنے بچھونے میں لیٹی چھت کی کڑیوں کو تک رہی تھی اور اُسے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ اس بچہ کی وجہ سے سفانی کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔ تفکرات کی تند رو میں وہ یوں ہی بہا کی کہ ایکا ایکی اُسے وہم ہوا "اگر خدا نہ کرے یہ بچّہ زندہ رہا تو سلطنت کے کاموں میں رخنہ پڑے گا اور اگر مر بھی جائے تو ممکن ہے میرے زندہ رہنے سے پھر کوئی ایسا ہی بچہ پیدا ہو.........!"

رات آدھی جاچکی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکلی۔

علی الصّباح تمام محل میں شور مچ گیا کہ ولیعہد بہادر کے گلے میں جو مفلر لپٹا ہوا تھا، اُس کا پھندا لگ جانے سے اُن کا انتقال ہوگیا ہے ______

اور جب وہ اس کی اطلاع ملکہ کو دینے آئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ وہ بھی اس دنیائے آب وگل سے رخصت ہو چکی ہیں۔

اختتامیہ

مینا کی موت کو بیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ لیکن اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے سفائی نے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔ اس کے احباب اور اراکین حکومت نے انتہائی کوشش کی کہ وہ عقد ثانی کرلے مگر سب ناکام رہے اور پھر شادی کر لینے سے ہوگا بھی کیا؟۔

اُسے مسرور رکھ سکتا ہے کون افلاک کے نیچے
مسرت جس کی قسمت نے دبا دی خاک کے نیچے

بیشک اُسے ہر طرح کا عیش و آرام میسر ہے۔ ہر قسم کا ساز و سامان مہیا ہے اور وہ ہر لحاظ سے دنیوی تفکرات سے آزاد ہے، مگر اس کے دائرہ حیات میں ایک خلا بھی تو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اُس کی روح ہر دم بے قرار رہتی ہے۔ اس کے دل کی کلی کسی طرح نہیں کھلتی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کبھی نہیں آتی اور وہ نہیں جانتا کہ اطمینان قلب کسے کہتے ہیں ——————!

سنہ ۱۹۳۴ء

(مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی)

چراغِ حرم

از

مسٹر صادق الخیری دہلوی۔ ایم۔ اے

اِس مجموعے میں صادق الخیری کے بارہ مثالی افسانے شامل ہیں جن کا انتخاب خود مصنف نے اُن افسانوں میں سے کیا ہے جو عصمت۔ ہمایوں۔ ساقی۔ ادبی دنیا۔ شاہکار۔ ادبِ لطیف رومان۔ نیرنگ خیال۔ عالمگیر۔ الناظر۔ ندیم وغیرہ بلند پایہ رسائل چھپ اور ان سے دیگر اخبارات ور سائل میں نقل ہو کر ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ایک اضطرابِ تحسین پیدا کر چکے ہیں۔

صادق الخیری نے زندگی اور اسکی بوقلموں کیفیات کا جس وقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اور انہیں جس لطیف و دلکش انداز سے ان رومان پرست اور حیات افسانہ نگار، ادب ور وایات ادب کے بلند ترین مقاموں تک پہنچ گیا ہے اپنی طرز نگارش اور اسلوب قصّہ گوئی نے ملک کے صاحبِ نظر" ادب کاروں" سے جو خراج تحسین و ستائش حاصل کیا ہے اسکے چند اقتباس ملاحظہ فرمایئے!۔

مولانا نیاز فتح پوری ایڈیٹر نگار:۔

صادق الخیری ان بہترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو اسوقت ایک "فنکار" کی حیثیت رکھتے ہیں۔....... گو وہ اپنے سن کے لحاظ سے ابھی بچے ہیں۔ لیکن اپنی اہلیت و قابلیت کے لحاظ سے ایک دیرینہ سال مفکر اور کہنہ مشق ادیب نظر آتے ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے!"

(۱۹۴۳ء)

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ ایم۔ اے:۔

صادق الخیری کے افسانوں کا مقصد اخلاقی اور سماجی اصلاح ہے اور وہ اسمیں کامیاب نظر آتے ہیں۔ واقعیت ان کے پلاٹ کا خاص جزو ہے جو شبابات کا جوش و خروش لیئے ہوئے ہے۔ رومان کا پہلو ضبط اور تزکیۂ نفس کا پہلو لیئے ہوئے ہوتا ہے۔..... افسانے کی جتنی فنی ضروریات ہیں صادق صاحب ان سب کا خیال رکھتے ہیں۔ زبان ایسی صاف ستھری اور منجھی ہوئی لکھتے ہیں کہ فصاحت اُسپر ہزار جان سے قربان ہے۔ محاورے کا صحیح اور برمحل استعمال لطفِ سخن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ (سنہ ۱۹۴۱ء)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی:۔

صادق الخیری نے چار پانچ سال کے اندر ہی اپنے سنجیدہ علمی ذوق اور اعلیٰ انشاپردازانہ قابلیت کیوجہ سے بہت سے پختہ ادیبوں سے بھی زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے اس غیرمعمولی کامیابی کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان، اسلوب بیان، تخیل اور رجحان، ہر ایک لحاظ سے اُنکو فطرت کی طرف سے اُن کو وافر نعمتیں دی گئی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ترقی پسند ادب کے موجودہ بحران میں صادق الخیری جیسے سنجیدہ دماغ ادیبوں کی کوششوں سے ایک متوازن اور شائستہ فضا پیدا ہو سکے گی اور خیال و بیان کی اُن تلخیوں اور عریانیوں کا ایک گونہ سدّباب ہو جائیگا جو سمّیت اور کراہیت پیدا کرتی نظر آرہی ہیں۔ اور جن کیوجہ سے خود ترقی پسند ادب کی مفید تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء

چراغِ حرم صادق الخیری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔
کتابت طباعت نہایت عمدہ۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔ ضخامت کم و بیش دو سو ۲۰۰ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش۔ سرورق نظر فریب۔ قیمت عہ